جلد ۵ عدد ۴

شوال ۱۳۵۳ھ

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰

رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ ۸ر

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اسکے ابتدائی تین ابواب کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو

(۱) اسلامی جہاد کی حقیقت۔ انسانی جان کا احترام۔ دنیا پر اسلامی تعلیم کا اخلاقی اثر۔ قتل بالحق۔ قتل بالحق و بغیر حق کا فرق۔ ناگزیر خونریزی۔ اجتماعی فتنہ اور اس کا علاج۔ جنگ ایک اخلاقی فرض۔ جنگ کی مصلحت۔ جہاد فی سبیل اللہ کے معنی۔ حق و باطل کی حد بندی۔ جہاد فی سبیل اللہ کی فضیلت۔ فضیلت جہاد کی وجہ۔ نظام تمدن میں جہاد کا درجہ

(۲) مدافعانہ جنگ۔ دفاع کی ضرورت و اہمیت۔ دفاع ایک مذہبی فریضہ۔ مدافعانہ جنگ کی صورتیں:۔
(۱) راہ حق کی حفاظت (۲) عقد و عہد شکنی کی سزا (۳) گھر کے بھیدیوں اور اندرونی دشمنوں کا استیصال (۴) دارالاسلام کے امن کی حفاظت (۵) مظلوم مسلمانوں کی حمایت۔ دفاع کی اصلی غرض۔ استعداد قوت کی دائمی تاکید۔

(۳) مصلحانہ جنگ۔ مسلمانوں کی زندگی کا اصلی مقصد۔ اجتماعی فرائض کا اخلاقی تصور۔ اجتماعی فرائض کا اسلامی تصور۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ حیات اجتماعی میں اس کا درجہ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرق۔ نہی عن المنکر کا طریقہ۔ فتنہ و فساد کے خلاف جنگ۔ فتنہ کی تحقیق۔ فساد کی تحقیق۔ حکومت الٰہی کے قیام کی ضرورت۔ قتال کا حکم۔ قتال کی غرض و غایت۔ جزیہ کی حقیقت۔ قتال کی آخری حد۔ اسلام اور جہانگیری۔ اسلامی فتوحات کی توجیہہ۔ حکومت صرف صالحین کا حق ہے۔

قیمت: بلا جلد للعہ سکہ انگریزی للعہ/۱۲ سکہ عثمانیہ
مجلد صہ " " صہ/۱۲ " "

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ شوال ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

دوسری صدی ہجری کی ابتداء کا واقعہ ہے کہ سجستان و رُخّج کے فرمانروا نے جس کا خاندانی لقب رُتبیل تھا بنی اُمیّہ کے عمال کو خراج دینا بند کر دیا۔ پیہم چڑھائیاں کی گئیں مگر وہ مطیع نہ ہوا۔ یزید بن عبد الملک کے عہد میں جب اس کے پاس طلب خراج کے لئے سفارت بھیجی گئی تو اس نے مسلمانوں کے سفراء سے دریافت کیا کہ :-

"وہ لوگ کہاں گئے جو پہلے آیا کرتے تھے؟ ان کے پیٹ فاقہ زدوں کی طرح پچکے ہوئے ہوتے تھے۔ پیشانیوں پر سیاہ گٹے پڑے رہتے تھے اور کھجور کی چھال کی چپلیں پہنا کرتے تھے"

کہا گیا کہ وہ لوگ تو گذر گئے۔ رتبیل نے کہا :-

"اگرچہ تمہاری صورتیں ان سے زیادہ شاندار ہیں۔ مگر وہ تم سے زیادہ عہد کے پابند تھے اور تم سے زیادہ طاقتور تھے۔"

مورخ لکھتا ہے کہ یہ کہکر رُتبیل نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا اور تقریباً نصف صدی تک وہ اسلامی حکومت سے آزاد رہا۔

یہ اُس عہد کا واقعہ ہے جب تابعین و تبع تابعین کثرت سے موجود تھے۔ ائمہ مجتہدین کا زمانہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کو صرف ایک صدی گزری تھی۔ مسلمان ایک زندہ اور طاقتور قوم کی حیثیت سے دنیا پر چھائے جا رہے تھے۔ ایران، روم، مصر، افریقہ، اسپین وغیرہ ممالک کے وارث ہو چکے تھے۔ اور

ساز و سامان، شان و شوکت، اور دولت و ثروت کے اعتبار سے اس وقت دنیا کی کوئی قوم ان کی ہم پلہ نہ تھی۔ یہ سب کچھ تھا۔ دلوں میں ایمان بھی تھا۔ احکام شریعت کی پابندی اب سے بہت زیادہ تھی۔ سمع و طاعت کا نظام قایم تھا۔ پوری قوم میں ایک زبردست ڈسپلن پایا جاتا تھا۔ مگر پھر بھی جو لوگ عہد صحابہ کے فاقہ کش، خستہ حال صحرا نشینوں سے زور آزمائی کر چکے تھے۔ انہوں نے ان سر و سامان والوں اور ان بے سر و سامانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق محسوس کیا۔ یہ کس چیز کا فرق تھا؟ فلسفۂ تاریخ والے اس کو محض بداوت اور حضریت کے فرق پر محمول کرینگے۔ وہ کہیں گے کہ پرانے بادیہ نشین زیادہ جفاکش تھے اور بعد کے لوگوں کو دولت اور تمدن نے عیش پسند بنا دیا تھا۔ مگر میں کہونگا کہ یہ فرق دراصل ایمان، خلوص نیت، اخلاق اور اطاعتِ خدا و رسول کا فرق تھا۔ مسلمانوں کی اصلی قوت یہی چیزیں تھیں۔ ان کی قوت نہ کثرتِ تعداد پر مبنی تھی۔ نہ اسباب و آلات کی افراط پر۔ نہ مال و دولت کی فراوانی پر۔ نہ علوم و صناعات کی مہارت پر۔ نہ تمدن و حضارت کے لوازم پر۔ وہ صرف ایمان و عمل صالح کے بل پر ابھرے تھے۔ اسی چیز نے ان کو دنیا میں سربلند کیا تھا، اسی نے قوموں کے دلوں میں ان کی دھاک اور ساکھ بٹھائی تھی۔ جب قوت و عزت کا یہ سرمایہ تھا تو وہ قلت تعداد اور بے سر و سامانی کے باوجود طاقت ور اور معزز تھے۔ اور جب یہ سرمایہ ان کے پاس کم ہوتا گیا تو وہ کثرت تعداد اور ساز و سامان کی فراوانی کے باوجود کمزور اور بے وقعت ہوتے چلے گئے۔

رُتبیل نے ایک دشمن کی حیثیت سے جو کچھ کہا وہ دوستوں اور ناصحوں کے ہزار وعظوں سے زیادہ سبق آموز ہے۔ اس نے دراصل یہ حقیقت بیان کی تھی کہ کسی قوم کی اصلی طاقت اس کی آراستہ فوجیں، اس کے آلات جنگ، اس کے خوش خور و خوش پوش سپاہی، اور اس کے وسیع ذرائع و وسائل نہیں ہیں، بلکہ اس کے پاکیزہ اخلاق، اس کی مضبوط سیرت، اس کے صحیح معاملات، اور اس کے بلند تخیلات ہیں۔

یہ طاقت وہ روحانی طاقت ہے جو مادّی وسائل کے بغیر دنیا میں اپنا سکہ چلا دیتی ہے۔ خاک نشینوں کو تخت نشینوں پر غالب کردیتی ہے۔ صرف زمینوں کا وارث ہی نہیں بناتی بلکہ دلوں کا مالک بھی بنا دیتی ہے۔ اس طاقت کے ساتھ کھجور کی چھلیاں پہننے والے، سوکھی ہڈیوں والے، بے رونق چہروں والے، چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی تلواریں رکھنے والے دنیا پر وہ رعب، وہ سطوت و جبروت، وہ قدر و منزلت، وہ اعتبار و اقتدار جما دیتے ہیں جو اس طاقت کے بغیر شاندار لباس پہننے والے، بڑے ڈیل ڈول والے، بارونق چہروں والے، اونچی بارگاہوں والے، بڑی بڑی منجنیقیں اور ہولناک دبابے رکھنے والے نہیں جما سکتے۔ اس روحانی طاقت کی فراوانی مادّی وسائل کے فقدان کی تلافی کر دیتی ہے۔ مگر مادی وسائل کی فراوانی اس طاقت کے فقدان کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔ اس طاقت کے بغیر محض مادی وسائل کے ساتھ اگر غلبہ نصیب ہو بھی گیا تو ناقص اور عارضی ہوگا، کامل اور پائدار نہ ہوگا۔ دل کبھی مسخر نہ ہونگے۔ صرف گردنیں جھک جائینگی اور وہ بھی اکڑنے کے پہلے موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے مستعد رہینگی۔

کسی عمارت کا استحکام اس کے رنگ و روغن، نقش و نگار، زینت و آرائش، صحن و چمن اور ظاہری خوش نمائی سے نہیں ہوتا۔ نہ مکینوں کی کثرت، ساز و سامان کی افراط اور اسباب و آلات کی فراوانی اس کو مضبوط بناتی ہے۔ اگر اس کی بنیادیں کمزور ہوں، دیواریں کھوکھلی ہوں، ستونوں کو گھن لگ جائے، کڑیاں اور تختے بوسیدہ ہو جائیں تو اس کو گرنے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی خواہ وہ مکینوں سے خوب معمور ہو اور اس میں کروروں روپے کا مال و اسباب بھرا پڑا ہو، اور اس کی سجاوٹ نظروں کو لبھاتی اور دلوں کو موہ لیتی ہو۔ تم صرف ظاہر کو دیکھتے ہو۔ تمہاری نظریں مدنظر پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ مگر حوادث زمانہ کا معاملہ نمائشی مظاہر سے نہیں بلکہ اندرونی حقایق سے پیش آتا ہے۔ وہ عمارت کی بنیادوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ دیواروں کی پختگی کا امتحان لیتے ہیں۔ ستونوں کی استواری کو جانچتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں مضبوط اور

مستحکم ہوں تو زمانے کے حوادث ایسی عمارت سے ٹکرا کر پلٹ جائینگے اور وہ ان پر غالب آجائیگی خواہ وہ زینت و آرائش سے یکسر محروم ہو۔ ورنہ حوادث کی ٹکریں آخرکار اس کو پاش پاش کرکے رہینگی اور وہ اپنے ساتھ اپنے مکینوں اور اپنے اسباب زینت کو بھی لے بیٹھے گی۔

ٹھیک یہی حال حیات قومی کا بھی ہے۔ ایک قوم کو جو چیز زندہ اور طاقت ور اور سربلند بناتی ہے وہ اس کے مکان، اس کے لباس، اس کی سواریاں، اس کے اسباب عیش، اس کے فنون لطیفہ، اس کے کارخانے، اس کے کالج اور اس کے آلات نہیں ہیں، بلکہ وہ اصول ہیں جن پر اس کی تہذیب قایم ہوتی ہے، اور پھر ان اصولوں کا دلوں میں راسخ ہونا اور اعمال پر حکمراں بن جانا ہے۔ یہ تین چیزیں یعنی اصول کی صحت، ان پر پختہ ایمان، اور عملی زندگی پر ان کی کامل فرمانروائی، حیات قومی میں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو ایک عمارت میں اس کی مستحکم بنیادوں، اس کی پختہ دیواروں اور اس کے مضبوط ستونوں کی ہے۔ جس قوم میں یہ تینوں چیزیں بدرجۂ اتم موجود ہوں وہ دنیا پر غالب ہوکر رہیگی، اس کا کلمہ بلند ہوگا، خدا کی زمین میں اس کا سکہ چلے گا، دلوں میں اس کی دھاک بیٹھے گی، گردنیں اس کے حکم کے آگے جھک جائیںگی اور عزت اسی کی عزت ہوگی۔ خواہ وہ جھونپڑیوں میں رہتی ہو، پھٹے پرانے کپڑے پہنتی ہو، فاقوں سے اس کے پیٹ پچکے ہوئے ہوں، اس کے ہاں ایک بھی کالج نہ ہو، اس کی بستیوں میں ایک بھی دھواں اڑانے والی چمنی نظر نہ آئے، اور علوم و صناعات میں وہ بالکل صفر ہو۔ تم جن چیزوں کو سامان ترقی سمجھ رہے ہو وہ محض عمارت کے نقش و نگار ہیں۔ اس کے قوایم و ارکان نہیں ہیں۔ کھوکھلی دیواروں پر اگر تم سونے کے پترے بھی چڑھا دوگے تو وہ ان کو گرنے سے نہ بچا سکینگے۔

یہی بات ہے جس کو قرآن مجید بار بار بیان کرتا ہے۔

وہ اسلام کے اصولوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ اس اٹل اور غیر متغیر فطرت کے مطابق

ہیں جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اس لیے جو دین ان اصولوں پر قایم کیا گیا ہے وہ دین قیم ہے یعنی ایسا دین جو معاش و معاد کے جملہ معاملات کو ٹھیک ٹھیک طریقوں پر قایم کر دینے والا ہے۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰: ۴)۔

پھر وہ کہتا ہے کہ اس دین قیم پر مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اس پر ایمان لاؤ اور اس کے مطابق عمل کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں تم ہی سربلند ہوگے، تم ہی کو زمین کا وارث بنایا جائیگا، تم ہی خلعت خلافت سے سرفراز ہوگے۔ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (۲۱: ۷) وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳: ۱۴) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴: ۷) وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵: ۸)۔

بخلاف اس کے جو لوگ بظاہر دین کے دائرے میں داخل ہیں مگر دین نہ تو اُن کے دلوں میں بیٹھا ہے اور نہ اُن کی زندگی کا قانون بنا ہے۔ ان کے ظاہر تو بہت شاندار ہیں۔ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ۔ اور ان کی باتیں بھی بہت مزے دار ہیں۔ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ مگر حقیقت میں وہ لکڑی کے کندے ہیں جن میں جان نہیں كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ وہ خدا سے زیادہ انسانوں سے ڈرتے ہیں۔ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ان کے اعمال سراب کی طرح ہیں کہ دیکھنے میں پانی نظر آئیں مگر حقیقت میں کچھ نہیں۔ اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـًٔا ایسے لوگوں کو اجتماعی قوت کبھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ان کے دل آپس میں پھٹے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ خلوص نیت کے ساتھ کسی کام میں اشتراک عمل نہیں کر سکتے۔ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ان کو وہ قوت ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی جو صرف

مومنین، صالحین کا حصہ ہے لَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ جَمِیْعًا اِلَّا فِیْ قُرًی مُّحَصَّنَۃٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ۔ یہ ظالم ہیں جن کو دنیا کی امامت کا منصب کبھی نہ ملے گا۔ قَالَ لَا یَنَالُ عَہْدِی الظّٰلِمِیْنَ ان کے لئے بجز اس کے اور کوئی انجام نہیں کہ دنیا میں بھی ذلت وخواری اور آخرت میں بھی عذاب وعقاب۔ لَھُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔

آپ تعجب کرینگے کہ قرآن نے مسلمانوں کی ترقی اور اُن کے ایک حکمران قوم بننے اور سب پر غالب آجانے کا ذریعہ صرف ایمان وعمل صالح کو قرار دیا، اور کہیں یہ نہیں کہا کہ تم یونیورسٹیاں بناؤ، کالج کھولو، کارخانے قایم کرو، جہاز بناؤ، کمپنیاں قایم کرو، بینک کھولو، سائنس کے آلات ایجاد کرو، اور لباس، معاشرت، انداز واطوار میں ترقی یافتہ قوموں کی نقل کرو۔ نیز اس نے تنزل وانحطاط اور دنیا وآخرت کی ذلت ورسوائی کا واحد سبب نفاق کو ٹھیرایا نہ کہ اُن اسباب کے فقدان کو جنہیں آج کل کی دنیا اسباب ترقی سمجھتی ہے۔

لیکن اگر آپ قرآن کی اسپرٹ کو سمجھ لیں تو آپ کا یہ تعجب خود رفع ہو جائیگا۔ سب سے پہلی بات جس کا سمجھنا ضروری ہے، یہ ہے کہ "مسلمان" جس شئے کا نام ہے اس کا قوام بجز "اسلام" کے اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کی حقیقت صرف اسلام سے متحقق ہوتی ہے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان رکھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور اُن قوانین کا اتباع کرے جن کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ سے نازل کیا گیا ہے، تو اس کا اسلام متحقق ہو جائیگا خواہ ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے ساتھ شامل نہ ہو جو اسلام کے ماسوا ہیں۔ بخلاف اس کے اگر وہ ان تمام زیوروں سے آراستہ ہو جو زینت حیات دنیا کے قبیل سے ہیں، مگر ایمان اس کے دل میں نہ ہو اور قوانین اسلامی کے اتباع سے اس کی زندگی خالی، تو وہ گریجویٹ ہو سکتا ہے، ڈاکٹر ہو سکتا ہے، کارخانہ دار ہو سکتا ہے، بینکر ہو سکتا ہے، جنرل یا امیر البحر ہو سکتا ہے، غرض سب کچھ ہو سکتا ہے، مگر مسلمان نہیں ہو سکتا۔

پس کوئی ترقی کسی مسلمان شخص یا قوم کی ترقی نہ ہوگی جب تک کہ سب چیزوں سے پہلے اُس شخص یا قوم میں حقیقت اسلامی متحقق نہ ہوجائے۔ اس کے بغیر وہ ترقی خواہ وہ کیسی ہی ترقی ہو، مسلمان کی ترقی نہ ہوگی اور ایسی ترقی ظاہر ہے کہ اسلام کا نصب العین نہیں ہوسکتی۔

پھر ایک بات تو یہ ہے کہ کوئی قوم سرے سے مسلمان نہ ہو، اور اس کے افکار و اخلاق اور نظام اجتماعی کی اساس اسلام کے سوا کسی اور چیز پر ہو۔ ایسی قوم کے لیے تو بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ وہ ان اخلاقی سیاسی، معاشی اور عمرانی اصولوں پر کھڑی ہوسکے جو اسلام سے مختلف ہیں، اور اس ترقی کے منتہا کو پہنچ جائے جس کو وہ اپنے نقطۂ نظر سے ترقی سمجھتی ہے۔ لیکن یہ بالکل ایک امر دیگر ہے کہ کسی قوم کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، اور سیاست کی بنیاد اسلام پر ہو، اور اسلام ہی میں وہ عقیدے اور عمل دونوں کے لحاظ سے ضعیف ہو۔ ایسی قوم مادی ترقی کے وسائل خواہ کتنی ہی کثرت اور فراوانی کے ساتھ مہیا کرلے، اس کا ایک مضبوط اور طاقت ور قوم کی حیثیت سے اٹھنا اور دنیا میں سربلند ہونا قطعاً غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اس کی قومیت اور اس کے اخلاق اور تہذیب کی اساس جس چیز پر ہے، وہی کمزور ہے، اور اساس کی کمزوری ایسی کمزوری ہے جس کی تلافی محض اوپری زینت کے سامان کبھی نہیں کرسکتے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ علوم و فنون اور مادی ترقی کے وسائل کی جائز اہمیت سے انکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ مسلمان قوم کے لیے یہ تمام چیزیں ثانوی درجہ میں ہیں۔ اساس کا استحکام ان سب پر مقدم ہے۔ وہ جب مستحکم ہوجائے تو مادی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کیے جاسکتے ہیں جو اس بنیاد کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ لیکن اگر وہ مضمحل ہو، دل میں اس کی جڑیں کمزور ہوں، اور زندگی پر اس کی گرفت ڈھیلی ہوجائے تو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے قوم کے اخلاق کا فاسد ہونا، سیرت کا بگڑ جانا، معاملات کا خراب ہوجانا، نظام اجتماعی کی بندشوں کا سست ہوجانا، اور قوتوں کا پراگندہ ہوجانا ناگزیر ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ

یہ ہے کہ قوم کی طاقت کمزور ہو جائے اور بین المللی قوتوں کے ترازو میں اس کا پلڑا روز بروز ہلکا ہوتا چلا جائے یہاں تک کہ دوسری قومیں اس پر غالب آجائیں۔

ان سب سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ہے۔ قرآن حکیم نہایت وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ "تم ہی سربلند ہوگے اگر تم مومن ہو" اور "اللہ کی پارٹی والے ہی غالب ہونگے"۔ اور "جو لوگ ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہونگے ان کو زمین کی خلافت ضرور ملے گی"۔ اس وثوق کی بنیاد کیا ہے؟ کس بنا پر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ دوسری قومیں خواہ کیسے ہی مادی وسائل کی مالک ہوں ان پر مسلمان صرف ایمان اور عمل صالح کے اسلحہ سے غالب آجائینگے؟

اس عقدے کو خود قرآن حل کرتا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَابًا وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ۔ مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔ (۲۲ : ۱۰)

لوگو ایک مثال بیان کیجاتی ہے۔ اس کو غور سے سنو! خدا کو چھوڑ کر تم جن چیزوں کو پکارتے ہو وہ ایک مکھی تک کو پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کام کے لئے ملکر زور لگائیں اور اگر ایک مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اس سے وہ چیز چھڑا لینے کی قدرت بھی ان میں نہیں۔ مطلوب بھی ضعیف اور اس کا طالب بھی ضعیف۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ کی جیسی کرنی چاہیے تھی حالانکہ درحقیقت اللہ ہی قدرت اور عزت والا ہے۔

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ (۲۹ : ۴)

جن لوگوں نے خدا کے سوا دوسروں کو کارساز ٹھیرایا ان کی مثال ایسی ہے جیسے مکڑی کہ وہ گھر بناتی ہے حالانکہ سب گھروں سے زیادہ کمزور گھر مکڑی کا گھر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مادی طاقتوں پر اعتماد کرتے ہیں، اُن کا اعتماد دراصل ایسی چیزوں پر ہے جو بذاتِ خود کسی قسم کی بھی قوت و قدرت نہیں رکھتیں۔ ایسے بے زوروں پر اعتماد کرنے کا قدرتی نتیجہ ہے کہ وہ خود بھی بے زور ہو جاتے ہیں، وہ اپنے نزدیک جو مستحکم قلعے بناتے ہیں وہ مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہیں۔ ان میں کبھی یہ طاقت ہو ہی نہیں سکتی کہ ان لوگوں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکیں جن کا اعتماد حقیقی قدرت و عزت رکھنے والے خدا پر ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲: ۲۲)

جو طاغوت کو چھوڑ کر اللہ پر ایمان لے آیا اس نے مضبوط رسّی تھام لی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

قرآن دعوے کے ساتھ کہتا ہے کہ جب کبھی اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کا مقابلہ ہو گا تو غلبہ اہلِ ایمان ہی کو حاصل ہو گا۔

وَلَوْ قَاتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۴۸: ۳)

اور اگر وہ جنہوں نے کفر کیا ہے تم سے جنگ کرینگے تو ضرور پیٹھ پھیر جائینگے پھر کوئی یار و مددگار نہ پائینگے یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آرہی ہے اور تم کبھی اللہ کی سنت میں تغیر نہ پاؤ گے۔

سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا (۳: ۱۶)

ہم کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دینگے کیونکہ انہوں نے خدا کے ساتھ اُن چیزوں کو شریک کر لیا ہے جن کو خدا نے کوئی تمکن نہیں بخشا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خدا کی طرف سے لڑتا ہے اس کے ساتھ خدائی طاقت ہوتی ہے، اور جس کے ساتھ خدائی طاقت ہو اس کے مقابلے میں کسی کا زور چل ہی نہیں سکتا

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷: ۱۱)

یہ اس لئے کہ ایمانداروں کا مددگار تو اللہ ہے اور کافروں کا مددگار کوئی نہیں۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸: ۱۷)

جب تونے پھینکا تو وہ تو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا۔

یہ تو مومن صالح کی سطوت کا حال ہے۔ دوسری طرف یہ بھی خدا کا قانون ہے کہ جو شخص ایماندار ہوتا ہے جس کی سیرت پاکیزہ ہوتی ہے، جس کے اعمال نفسانیت کی آلودگیوں سے پاک ہوتے ہیں، اور جو ہوائے نفس اور اغراض نفسانی کے بجائے، خدا کے مقرر کیے ہوئے قانون کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرتا ہے، اس کی محبت اور عزت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے، دل آپ ہی آپ اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں، نگاہیں اس کی طرف احترام سے اٹھتی ہیں، معاملات میں اس پر اعتماد کیا جاتا ہے، دوست تو دوست دشمن تک اس کو امین و صادق سمجھتے ہیں اور اس کے عدل، اس کی عفت، اور اس کی وفاشعاری پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (۱۹: ۶)۔

جو لوگ ایمان لے آئے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے یقیناً اللہ تعالیٰ دلوں میں محبت ڈال دیگا۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ (۱۴: ۱۴)

ایمان لانے والوں کو اللہ قول ثابت کے ساتھ جما دیتا ہے، دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۱۶: ۱۳)

جو کوئی نیک عمل کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور اس کے ساتھ وہ مومن بھی ہو تو ہم ضرور اس کو بہترین زندگی بسر کرائینگے اور ان بہترین اعمال کا اجر دینگے جو وہ کرتے رہے ہیں۔

مگر یہ سب کس چیز کے نتائج ہیں؟ محض زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہنے کے نہیں مسلمانوں کے سے نام رکھ لینے اور معاشرت کے چند مخصوص اطوار اختیار کرنے اور چند گنی چنی رسمیات ادا کر لینے کے نہیں۔ قرآن حکیم ان نتائج کے ظہور کے لیے ایمان اور عمل صالح کی شرط لگاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت تمہارے قلب و روح میں اس قدر جاگزیں ہو جائے کہ تمہارے تخیلات و افکار اور اخلاق و معاملات سب پر اسی کا غلبہ ہو، تمہاری ساری زندگی اسی کلمۂ طیبہ کے معنوی قالب میں ڈھل جائے، تمہارے ذہن میں کوئی ایسا خیال راہ نہ پا سکے جو اس کلمہ کے معنی سے مختلف ہو، اور تم سے کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جو اس کلمہ کے مقتضیٰ کے خلاف ہو۔ لا الٰہ الا اللہ کو زبان سے ادا کرنے اور قلب سے اس کی تصدیق کرنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ تمہاری زندگی میں اس کے ساتھ ہی ایک انقلاب برپا ہو جائے۔ تمہاری رگ رگ میں تقویٰ کی روح سرایت کر جائے۔ پھر اللہ کے سوا تمہاری گردن کسی طاقت کے آگے نہ جھکے، اللہ کے سوا تمہارا ہاتھ کسی کے آگے نہ پھیلے، اللہ کے سوا کسی کا خوف تمہارے دل میں نہ رہے، اللہ کے سوا کسی کو راضی کرنے کی خواہش تمہارے قلب میں باقی نہ رہے، تمہاری محبت اور تمہارا بغض اللہ کے سوا کسی اور کے لیے نہ ہو، اللہ کے قانون کے سوا تمہاری زندگی پر کسی اور کا قانون نافذ نہ ہو، تم اپنے نفس اور اس کی ساری خواہشوں اور اس کے تمام مرغوبات و محبوبات کو اللہ کی خوشنودی پر قربان کر دینے کے لیے ہر وقت طیار رہو، اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مقابلہ میں تمہارے پاس سمعنا و اطعنا کے سوا کوئی اور قول اور فعل نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو تمہاری قوت صرف تمہارے اپنے نفس اور جسم کی قوت نہ ہوگی بلکہ اس احکم الحاکمین کی قوت ہوگی جس کے آگے زمین و آسمان کی ہر چیز طوعاً و کرہاً سربسجود ہے۔ اور تمہاری ذات اس نور السمٰوات والارض کے جلووں سے منور ہو جائیگی جو تمام عالم کا حقیقی محبوب و معشوق ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں یہی چیز مسلمانوں کو حاصل تھی۔ پھر اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا تاریخ کے اوراق اس پر شاہد ہیں۔ اس زمانہ میں جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اسکی کایا پلٹ ہوگئی۔ مس خام سے یکایک وہ کندن بن گیا۔ اسکی ذات میں وہ کشش پیدا ہوئی کہ دل اسکی طرف کھنچنے لگے۔ اس پر جسکی نظر پڑتی وہ محسوس کرتا کہ گویا تقویٰ اور پاکیزگی اور صداقت کو مجسم دیکھ رہا ہے۔ وہ ان پڑھ، مفلس، فاقہ کش، پشمینہ پوش اور بوریا نشین ہوتا، مگر پھر بھی اسکی ہیبت دلوں میں ایسی بیٹھتی کہ بڑے بڑے شان و شوکت والے فرمانرواؤں کو نصیب نہ تھی۔ ایک ایک مسلمان کا وجود گویا ایک چراغ تھا کہ جدھر وہ جاتا اسکی روشنی اطراف و اکناف میں پھیل جاتی اور اس ایک چراغ سے سینکڑوں ہزاروں چراغ جل جاتے۔ پھر جو اس کی روشنی قبول نہ کرتا اور اس سے ٹکرانے کی جرأت کرتا تو اس کو جلانے اور فنا کر دینے کی قوت بھی اس میں موجود تھی۔

ایسی ہی قوت ایمانی اور طاقت اور سیرت رکھنے والے مسلمان تھے کہ جب وہ ساڑھے تین سو سے زیادہ نہ تھے، تو انہوں نے تمام عرب کو مقابلہ کا چیلنج دیدیا، اور جب وہ چند لاکھ کی تعداد کو پہنچے تو ساری دنیا کو مسخر کرلینے کے عزم سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور جو قوت انکے مقابلے پر آئی پاش پاش ہوگئی۔

جیسا کہ کہا جاچکا ہے، مسلمان کی اصلی طاقت یہی ایمان اور سیرت صالحہ کی طاقت ہے جو صرف ایک لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت دل میں بیٹھ جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ حقیقت دل میں جاگزیں نہ ہو محض زبان پر یہ الفاظ جاری ہوں، مگر ذہنیت اور عملی زندگی میں کوئی انقلاب برپا نہ ہو، لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی انسان ویسا ہی کا ویسا ہی رہے جو اس سے پہلے تھا، اور اس میں اور لا الٰہ الا اللہ کا انکار کرنے والوں میں کوئی فرق نہ ہو، وہ بھی انہی کی طرح غیر اللہ کے آگے گردن جھکائے اور ہاتھ پھیلائے، انہی کی طرح غیر خدا سے ڈرے اور غیر خدا کی رضا چاہے اور غیر خدا کی محبت میں گرفتار ہو، انہیں کی طرح ہوائے نفس کا بندہ ہو، اور قانون الٰہی کو چھوڑ کر انسانی قوانین یا اپنے نفس کی خواہشات کا اتباع کرے، اسکے خیالات اور ارادوں اور نیتوں میں بھی وہی گندگی ہو جو ایک

غیر مومن کے خیالات، ارادات اور نیات بھی ہو سکتی ہے، اور اس کے اقوال و افعال و معاملات بھی ویسے ہی ہوں جیسے ایک غیر مومن کے ہو سکتے ہیں، تو پھر مسلمان کو نامسلمان پر فوقیت کس بنا پر ہو؟ روح ایمان اور روح تقوی نہ ہونے کی صورت میں ایک مسلمان ویسا ہی ایک بشر تو ہے جیسا ایک نامسلمان ہے۔ اسکے بعد مسلم اور غیر مسلم کا مقابلہ صرف جسمانی طاقت اور مادّی وسائل ہی کے اعتبار سے ہوگا، اور اس مقابلہ میں جو طاقت ور ہوگا وہ کمزور پر غالب آجائیگا۔

ان دونوں حالتوں کا فرق تاریخ کے صفحات میں اتنا نمایاں ہے کہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یا تو مٹھی بھر مسلمانوں نے بڑی بڑی حکومتوں کے تختے الٹ دیے تھے اور اٹک کے کنارے سے لے کر اٹلانٹک کے سواحل تک اسلام پھیلا دیا تھا۔ یا اب کروڑوں مسلمان دنیا میں موجود ہیں، اور غیر مسلم طاقتوں سے دبے ہوئے ہیں، اور جن آبادیوں میں کروروں مسلمان بستے ہیں اور ان کو بستے ہوئے صدیاں گزر چکی ہیں وہاں اب بھی کفر و شرک موجود ہے۔

اس رسالے میں مطبوعات کے عنوان سے عام کتابوں اور رسالوں پر جو مختصر انتقادات شائع ہوتے ہیں، وہ درحقیقت ہمارے مقاصد اور حدود سے خارج ہیں، کیونکہ "ترجمان القرآن" کا مقصد محض قرآن مجید کی خدمت ہے۔ لیکن ہم نے ان غیر متعلق انتقادات کیلیے تھوڑی سی جگہ صرف اس وجہ سے مخصوص کردی ہے کہ بعض اصحاب اپنی عنایت سے ہمارے پاس کتابیں اور رسالے بغرض تنقید بھیج دیتے ہیں، اور صحافت کے عمومی آداب کا مقتضی ہے کہ ان پر تنقید کیجائے۔ اپنے مقاصد و حدود سے اس حد تک تجاوز تو غالباً ہمارے لیے جائز ہے۔ لیکن ہماری کسی تنقید کے جواب میں کوئی لمبی چوڑی تحریر آئے تو اس تحریر کو شائع کرنا اور پھر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے ایک اور لمبی چوڑی تحریر سے رسالے کے صفحات کو بھرنا یقیناً بہت زیادہ تجاوز ہے جس کے لئے جواز کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔

یہ چند جملے اس لیے لکھے جارہے ہیں کہ گذشتہ ماہ شعبان کے پرچہ میں جناب بشارت احمد صاحب جنرل

سکریٹری جماعتہائے احمدیہ دکن کی کتاب "تصدیق احمدیت" پر جو تبصرہ کیا گیا تھا اُس کے جواب میں صاحب موصوف نے ایک طویل تحریر ارسال فرمائی ہے، اور اس کی اشاعت کو ہماری "قوتِ اظہار حق" کا گویا امتحان قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ آیندہ کسی موقع پر دوسرے مؤلفین و مصنفین کی جانب سے بھی ایسی ہی تحریریں آئیں اور اسی طرح ان کی اشاعت کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ اسلیے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ ایسی تحریریں شائع نہ کرنے کے لئے ایک عام معذرت نامہ شائع کردیں۔

اس سلسلہ میں ایک اصولی بات کی طرف اشارہ کردینا بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔ ہندوستان میں ایک مدت سے مذہبی مناظرات نے جو رنگ اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف متانت و سنجیدگی سے عاری ہے، بلکہ اُس مقصد کے بھی منافی ہے جس کے لیے مناظرہ کیا جاتا ہے۔ مناظرہ کا اصل مقصد اپنے مذہب کی صداقت کا اثبات ہے اور یہ صرف دلائل سے ہوسکتا ہے۔ دلائل اگر سنجیدگی کے ساتھ پیش کیے جائیں تو پڑھنے یا سننے والا ٹھنڈے دل سے اُن پر غور کر کے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن اگر ان کے ساتھ گرمی زبان و سختی کلام کا عنصر بھی شامل ہو جائے تو سامعین و ناظرین کے دل و دماغ اُس سکون کے حال نہیں رہتے جو صحیح غور و فکر کیلیے ضروری ہے۔ ایسے مناظرے خواہ کسی مذہب کی طرف سے کیے جائیں ہمارے نزدیک قابل اعتراض ہیں، اور اس مذہب کیلیے بھی نصرت کے موجب نہیں ہوسکتے جس کی تائید انکے ذریعہ سے کی جاتی ہے۔ یہی قاعدہ ہے جس کو ملحوظ رکھکر ہم نے جناب الیاس برنی صاحب کی کتاب "قادیانی مذہب" کی تائید کی، اور جناب بشارت احمد صاحب کی کتاب "تصدیق احمدیت" سے اختلاف کیا۔

جناب بشارت احمد صاحب کو خود اعتراف ہے کہ "بلا شبہ جناب برنی صاحب کی عبارت سلیس و متین ہے" اور "عبارت متانت و تہذیب سے پُر اور قلم قابو میں نظر آتا ہے۔" دوسری طرف وہ یہ بھی اعتراف فرماتے ہیں کہ "جو شکایت آپ نے اپنی تنقید میں کی ہے وہ شکایت اس سے پہلے خود میری جماعت کے بعض نازک و لطیف احساس رکھنے والے و نیز بعض ۔۔۔۔ دیگر احباب بھی کر چکے ہیں۔" لیکن اس کے باوجود وہ اپنے طرز عمل کو صرف اس بنا پر جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اقتباسات محولات میں ناجائز تصرف اور صریح تحریف ظاہر کر کے پبلک کو متوجہ کر کے کہتے ہیں کہ برنی صاحب نے محض اپنے من مانے عنوانات کی ترتیب سے وسوسہ پیدا کرنا چاہا ہے ورنہ نہ ہمارے یہ اعتقادات ہیں نہ ہماری کتابوں کے

وہ اقتباسات ہیں جو پیش کیے گئے۔"

مگر ہمارا اعتراض کسی "ناجائز تصرف" اور "صریح تحریف" کے اظہار پر نہ تھا بلکہ اس زبان پر تھا جو اس کے ساتھ استعمال کیگئی ہے۔ ہمارے نزدیک جناب بشارت احمد صاحب کے لیے صحیح طریق جواب یہ تھا کہ اپنی کتابوں سے اپنے مذہب کے اصل اعتقادات پیش کر دیتے اور برنی صاحب نے اگر "ناجائز تصرف" یا "صریح تحریف" سے کام لیا تھا تو اس کو صاف صاف ظاہر کر دیتے۔ مگر جب برنی صاحب نے حملہ متانت و تہذیب سے کیا تھا تو اسکی مدافعت غیر متین اور غیر سنجیدہ طریقے سے کرنا جائز نہ تھا۔ مہذب معترض کا جواب غیر مہذب طریقے سے دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ اس کو بھی خلاف تہذیب طریقوں کی طرف کھینچ لانا چاہتے ہیں، اور اپنا مفاد اسی میں دیکھتے ہیں کہ عام ناظرین کو ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع نہ دیں۔ یہ بات تو آپ کے مذہب کی کمزوری کو ظاہر کرتی ہے، اور خود آپ کی طرف سے لوگوں کو بدگمان کرنے والی ہے۔

جناب بشارت احمد صاحب نے اپنے طرز عمل کی تائید میں قرآن مجید سے بھی استدلال فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> "مجھے تو ایک نہایت پرانی کتاب کا جس کی ترجمانی کے لیے آپ نے اپنا رسالہ جاری فرمایا ہے صرف ایک چھوٹا سا جملہ یاد ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے تصدیق احمدیت میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اسکو کافی طور پر ملحوظ رکھا ہے کہ اِنَّ اللہَ لَا یُحِبُّ السُّوْٓءَ بِالْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ۔"

لیکن اس پرانی کتاب میں یہ جملہ ہمیں کہیں نہیں ملا۔ اصل آیت یہ ہے:۔ لَا یُحِبُّ اللہُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴: ۲۱)۔ اور اسی پرانی کتاب میں بار بار یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ (۲: ۲۴) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ (۱۶: ۶) قُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ اِنَّ الشَّیْطٰنَ کَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا (۱۷: ۶) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ (۲۳: ۶) وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللہِ (۴۲: ۴)

مقالات

کتب سماوی پر ایک نظر

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(۱۱)

از جناب ذوقی شاہ صاحب

پیشین گوئیاں | بائبل کی بعض پیشینگوئیوں پر عیسائی علمار کو بڑا ناز ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انجیلی پیشینگوئیوں پر بھی کسی قدر روشنی ڈالی جائے۔ نمونہ کے طور پر ہم صرف دو پیشینگوئیوں کو لیتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ خود کیا کہتی ہیں اور عیسائی علمار ان سے کیا سمجھتے ہیں۔

پیشنگوئی نمبر (۱) | یوحنا (۱: ۱۹ تا ۲۵) کی عبارت پہلے ملاحظہ فرمائی جائے جو حسب ذیل ہے:۔

"اور یوحنا کی گواہی یہ تھی جبکہ یہودیوں نے یروسلم سے کاہنوں (یعنی امامون) اور لاویوں (یعنی اُس فرقہ کے لوگ جس میں ہارون علیہ السلام تھے) کو بھیجا کہ اُس سے پوچھیں کہ تو کون ہے۔ اور اُس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب اُنھوں نے اُس سے پوچھا کہ پھر تو کون ہے۔ کیا تو الیاس ہے۔ اُس نے کہا میں نہیں ہوں۔ پس آیا تو وہ نبی ہے۔ اُس نے جواب دیا نہیں۔ × × × × × اور اُنھوں نے اُس سے سوال کیا اور کہا کہ اگر تو مسیح ہے نہ الیاس اور نہ وہ نبی پس کیوں بتسیمہ دیتا ہے"

اس عبارت کی پوری تفہیم کے لیے سب سے پہلے اس بات کے ذہن نشین کر رکھنے کی ضرورت ہے کہ اُس زمانہ کے یہودی توریت کی پیشینگوئیوں اور اپنی مذہبی روایات پر اعتماد کر کے تین نبیوں کی آمد کے انتظار میں تھے اور اُن تینوں کا ذکر اقتباس مندرجہ بالا میں آیا ہے۔ ایک مسیح۔ دوسرے الیاس تیسرے وہ جن کی جانب اشارہ "وہ نبی" سے اوپر کی عبارت میں کیا گیا ہے۔ یہودیوں نے یوحنا بپتسمہ دینے والے (John the Baptist) یعنی حضرت یحییٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کون ہیں۔ اس سے یہودیوں کی مراد یہ نہ تھی کہ آپ نبی ہیں یا غیر نبی۔ کیونکہ یہ سوال ہوتا تو آپ کا یہ جواب ہوتا کہ میں نبی ہوں۔ آپ کو اپنی نبوت کا پورا علم تھا (لوقا ۱: ۷۶ ملاحظہ ہو) اور کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اپنی نبوت سے انکار کرتے۔ بلکہ یہودیوں کا یہ مطلب تھا کہ جو نبی آنے والے ہیں اُن میں سے آپ کون ہیں۔ آپ نے یہودیوں کا مطلب پوری طرح سمجھ کر فرمایا کہ میں مسیح نہیں ہوں تب یہودیوں نے دوسرے آنے والے نبی کی جانب اشارہ کر کے پوچھا کہ کیا پھر آپ الیاس ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ تب یہودیوں نے تیسرے آنے والے نبی کی جانب اشارہ کر کے سوال کیا کہ کیا پھر آپ "وہ نبی" ہیں۔ آپ نے اس سے بھی انکار فرمایا۔ یعنی اس مکالمہ میں حضرت یحییٰ علیہ السلام نے صاف صاف فرما دیا کہ آپ نہ مسیح ہیں، نہ الیاس ہیں، نہ "وہ نبی"۔ گویا "وہ نبی" مسیح اور الیاس سے غیر ہیں اور آنے والے نبیوں میں اس درجہ مشہور و معروف ہیں کہ اُس زمانہ کے یہودیوں نے صرف "وہ نبی" کہا اور یحییٰ علیہ السلام پہچان گئے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ نبی کون ہیں؟ عیسائی علماء بڑے چکر میں ہیں کہ اس کا جواب کیا دیں۔ مگر مسلمان بلا خوف تردید کہتے ہیں کہ "وہ نبی" سے مراد محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ انجیل یوحنا کی مندرجہ بالا عبارت سے معقول پسند لوگوں کے لیے کسی اور نتیجہ پر آنا ناممکن ہے۔

توریت کی وہ پیشینگوئیاں جن کی بنا پر اُس زمانہ کے یہودی نبی آخر زمان حضرت محمد

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کا انتظار تھا حسب ذیل ہیں :-

استثنا، (۱۸ : ۱۵) میں موسیٰ علیہ السلام کا یہ قول درج ہے :-

"خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے میرے مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اُس کی طرف کان دھریو"

استثنا، (۱۸ : ۱۷ اور ۱۸) میں موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ :-

"اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے جو کچھ کہا سو اچھا کہا۔ میں اُن کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لیکے کہے گا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اس سے لوں گا۔"

انجیل میں بھی یہی پیشینگوئیاں نقل کی گئی ہیں۔ **اعمال** (۳ : ۲۲) میں ہے کہ :- ✓

"موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیئے ایک نبی میری مانند اٹھا دیگا جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب سُنو"

اعمال (۷ : ۳۷) میں ہے کہ :-

"یہ وہی موسیٰ ہے جس نے بنی اسرائیل سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے مجھ سا ایک نبی ظاہر کریگا اُسکی سنو"

یعنی یہ پیشینگوئیاں توریت اور انجیل دونوں میں اب تک موجود ہیں۔ مگر بات صرف اتنی سی ہے کہ عیسائی انھیں عیسیٰ علیہ السلام پر منطبق کرتے ہیں حالانکہ نظر انصاف سے دیکھا جائے

تو یہ انطباق صحیح نہیں۔

اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل سب سے پہلے اس بات کا صاف کر دینا ضروری ہے کہ استثناء (۱۸: ۱۵) میں جو "تیرے ہی درمیان سے" کے الفاظ ہیں وہ الحاقی ہیں۔ خدا کی طرف سے اس بارہ میں جو کچھ موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا تھا اور استثناء (۱۸: ۱۸) میں درج ہے اور اوپر منقول ہے اُس میں یہ الفاظ داخل نہیں۔ پطرس حواری نے جو استثناء (۱۸: ۱۵) کی عبارت اعمال (۳: ۲۲) میں نقل کی ہے اُس میں بھی یہ الفاظ نہیں۔ استیفان (استفنس) نے جب استثناء کی اس پیشینگوئی کو بیان کیا جو کہ اعمال (۷: ۳۷) میں درج ہے تو اس میں بھی یہ الفاظ مذکور نہیں۔ توریت کے مشہور ترجمہ سپٹواجنٹ میں بھی یہ الفاظ موجود نہیں۔ پھر "تیرے ہی درمیان سے" اور "تیرے ہی بھائیوں میں سے" دو بالکل جداگانہ اور مختلف بلکہ دو متضاد باتیں ہیں کہ ان میں سے اگر ایک صحیح ہو تو دوسری صحیح نہیں ہوسکتی اور توریتی محاورہ کے مطابق دونوں کا ہم معنی ہونا محال ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اب اصلی پیشینگوئی پر غور فرمائیے۔ خدا نے آنے والے نبی کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرمایا کہ:-

"میں اُن کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا
اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا" (استثناء ۱۸: ۱۸)

اُن کے لیے "یعنی بنی اسرائیل (بنی اسحٰق) کے لیے۔ "اُن کے بھائیوں میں سے" یعنی بنی اسمٰعیل میں سے۔ حضرت اسمٰعیل حضرت اسحٰق کے بھائی تھے اور توریتی محاورہ میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسحٰق (یعنی بنی اسرائیل) کا بھائی کہا گیا ہے۔ استثناء (۲: ۴) اور پیدائش (۱۶: ۱۲ - ۲۵: ۱۸) میں بنی اسمٰعیل کو بنی اسرائیل کا بھائی کہا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ جس آنے والے نبی کی خبر

دی گئی ہے وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا نہ کہ بنی اسرائیل سے، اگر وہ نبی بنی اسرائیل سے ہوتا تو فرمایا جاتا کہ "میں اُن کے لیے اُن میں سے تجھ سا نبی برپا کروں گا" حالانکہ ایسا نہیں فرمایا گیا۔ اگر "تیرے ہی درمیان سے" کے الفاظ الحاقی نہ سمجھے جائیں، حالانکہ اوپر ثابت کیا جاچکا ہے کہ وہ الحاقی ہیں تو ان الفاظ کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ وہ نبی اولاد ابراہیم سے ہوگا اور تمہارا ہم عقیدہ ہوگا یعنی تمہاری طرح خالص توحید کی تعلیم دینے والا ہوگا نہ کہ تثلیث کی۔ دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ "تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا" یعنی وہ نبی موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہوگا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو موسیٰ علیہ السلام سے زیادہ مشابہت ہے یا عیسیٰ علیہ السلام کو؟

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کبھی تو عیسائی علماء موسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) "چور اور بٹمار" اور عیسیٰ علیہ السلام کا دشمن قرار دیتے ہیں (جس کا ذکر ہمارے مضمون ع۲ میں آچکا ہے) اور کبھی مندرجہ بالا پیشینگوئی کو عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش میں آپ کو موسیٰ علیہ السلام کے مشابہ بیان کرتے ہیں۔ مسلمان یہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو مشابہت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل ہے وہ کسی دوسرے پیغمبر کو حاصل نہیں۔ استثناء (۳۴ : ۱۰) میں ہے کہ :-

"اب تک بنی اسرائیل میں موسیٰ کی مانند کوئی نبی نہیں اُٹھا جس سے خدا نے آمنے سامنے آشنائی کرتا"

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں سورہ مزمل میں فرماتا ہے کہ :-

إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ	ہم نے تمہارے پاس ایک تم پر گواہی دینے والا رسول
كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا -	بھیجا جیسا رسول کہ ہم نے فرعون پاس بھیجا تھا یعنی موسیٰ علیہ السلام

توریت کی رو سے بنی اسرائیل میں کوئی موسیٰ کے مانند پیدا نہ ہوا۔ اور قرآن کی رو سے بنی اسمٰعیل میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ السلام کے مانند پیدا ہوئے۔ اگر مشابہتوں میں مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو

یہ پیشینگوئی حضرت عیسیٰ پر کسی طرح صادق نہیں آتی۔ ان مشابہتوں کو اگر پوری تفصیل سے بیان کیا جائے تو اس کے لیے بہت سے اوراق پُر کرنے کی ضرورت ہوگی اس لیے ہم یہاں ایک مختصر فہرست کے درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ موسیٰ علیہ السلام ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ماں اور باپ سے پیدا ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام صرف ماں سے پیدا ہوئے۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام میں محض انسانیت و عبدیت تھی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی انسان کامل اور اللہ کے بندے تھے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام خود عیسائی عقیدہ کی رو سے اللہ کے بیٹے تھے۔

۳۔ موسیٰ علیہ السلام نے نکاح کیا اور عیال داری کے جملہ حقوق ادا کیے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی نکاح کیا اور پوری عیال داری برتی۔ عیسیٰ علیہ السلام تمام عمر ان باتوں سے آزاد رہے۔

۴۔ موسیٰ علیہ السلام انتقال کے بعد زمین میں دفن ہوئے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی جسد مطہر زمین ہی میں امانت ہے اور زمین کو ایسی امانتوں پر فخر ہے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کو اور آپ کے جسم کو زمین سے کوئی تعلق نہیں۔

۵۔ موسیٰ علیہ السلام کو چالیس برس بعد نبوت عطا ہوئی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی چالیس برس کی عمر میں مبعوث ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کی تو ساری عمر بھی چالیس برس کی نہ ہونے پائی تھی کہ آپ اُٹھا لیے گئے۔

۶۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر شریعت نازل ہوئی آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بھی شریعت نازل ہوئی۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی ہی کی پابندی کی اور اپنے شاگردوں کو بھی اسی کا حکم فرمایا۔

۷۔ شریعت موسوی اور شریعت محمدی کی باہمی مشابہتوں کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ایک پوری ضخیم کتاب لکھنی پڑے گی اور شریعتوں کی مشابہت ہی اس معاملہ میں اصل چیز ہے مگر مؤلف

موٹی باتیں جن میں کہ مشابہت بہت ہی نمایاں ہے یہ ہیں کہ :-

(۱) دونوں شریعتوں میں توحید خالص کی تعلیم ہے حالانکہ بقول عیسائیوں کے مسیح کی تعلیم میں تثلیث تھی۔ (۲) دونوں شریعتوں میں حدود و قصاص و تعزیرات و غسل و طہارت کے احکام پائے جاتے ہیں مگر انجیل ان سے خالی ہے۔ (۳) دونوں شریعتوں میں جہاد کی تعلیم اور جہاد کے احکام ہیں بلکہ دونوں پیغمبروں نے باقاعدہ فوج لے کر جہاد کیا بھی۔ حالانکہ مسیحی تعلیم یہ ہے کہ کوئی ایک رخسار پر طمانچہ مارے تو دوسرا رخسار بھی پیش کر دیا جائے اور عیسیٰ علیہ السلام کو کبھی اس قسم کی نوبت نہیں آئی کہ باقاعدہ فوج لے کر جہاد کیا ہو۔ (۴) دونوں شریعتوں میں ختنہ کا حکم ہے حالانکہ عیسائیوں کے نزدیک ختنہ ضروری نہیں۔ (۵) دونوں شریعتوں میں کثیر الازدواجی کی اجازت ہے حالانکہ عیسائیوں کے نزدیک یہ جرم ہے۔ غرضکہ دونوں پیغمبر نہ صرف صاحب شریعت ہونے میں باہم مشابہ ہیں بلکہ ان کی شریعتیں بھی بڑی حد تک آپس میں مشابہ ہیں حالانکہ عیسائی عقیدہ کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ (۸) آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّی تھے بقول جان ڈیون پورٹ کے موسیٰ علیہ السلام بھی اُمّی تھے حالانکہ عیسیٰ علیہ السلام اُمّی نہ تھے چنانچہ لوقا ۴: ۱۶ تا ۱۷) میں وہ واقعہ درج ہے جب آپ نے سبت کے دن عبادت خانے میں جا کر یسعیاہ نبی کی کتاب کو کھڑے ہو کر پڑھا اور سب کو سنایا۔ (۹) ان دونوں باہم مشابہ پیغمبروں نے گلہ بانی کی حالانکہ مسیح نے صرف استعارہ کے طور پر اپنے کو گڈریا کہا مگر کبھی گلہ بانی نہیں کی۔ (۱۰) دونوں پیغمبروں نے اغیار میں پرورش اور نشو و نما پائی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکین مکہ اور کعبہ کے بت پرستوں میں اور موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی صحبت میں۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام نے اپنوں میں ہی پرورش و تربیت و نشو و نما پائی (۱۱) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے جانشین فرمانروا ہوئے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بھی یشوع کی کتاب اور قاضیون کی کتاب کے مطابق فرمانروا ہوئے۔ مگر عیسیٰ علیہ السلام کے تین سو برس بعد تک کوئی عیسائی بادشاہ نہ ہوا اور یہ تین سو برس کا وقفہ آپ کو مماثلت زیر بحث سے خارج کر دیتا ہے (۱۲) موسیٰ علیہ السلام کی اولاد کا ہنوں یعنی اماموں

کے زیر حکم رہی (مفتاح الکتاب صفحہ ۵۱)۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا مرتبہ بھی اس معاملہ میں اظہر من الشمس ہے۔ لیکن جناب مسیح کو اس مماثلت میں بھی کوئی دخل نہیں۔ (۱۳) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا یَا عَلِیُّ اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ ھَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰی۔ دنیا میں اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا جس نے اپنے کو موسیٰ سے مشابہت دیکر اپنے بھائی کو اس طرح ہارون سے مشابہت دی ہو۔ (۱۴) عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بُت شکنی نہیں کی۔ موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے وغیرہ کو توڑا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کے بتوں کو پاش پاش کردیا۔ (۱۵) عیسیٰ علیہ السلام کے پاس نبوت کا کوئی ظاہری نشان نہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ید بیضا تھا اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت مبارک پر مہر نبوت تھی۔

بعض انبیاء میں دو ایک باتوں میں مشابہت باہمی کا ہونا اور بات ہے۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام میں اتنے بہت سے امور میں اس شدت کے ساتھ مشابہت و مماثلت عیاں ہے کہ اسکی نظیر اور پیغمبروں میں ملتی ہی نہیں۔ لہٰذا توریت کی مندرجۂ بالا پیشنگوئی میں محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی بابت بشارت تھی اور یہودی اس بشارت کو آپ ہی کے متعلق سمجھتے تھے اور آپ کے منتظر تھے اور اس کا چرچا اس قدر عام تھا اور یہ بات اتنی شہرت پائے ہوئے تھی کہ یہودیوں کو یحییٰ علیہ السلام سے سوال کرتے وقت کہ آپ کون ہیں صرف یہی اشارہ کر دینا کافی ہوا کہ کیا آپ "وہ نبی" ہیں۔ یحییٰ علیہ السلام نے بھی یہودیوں کے مافی الضمیر کو فی الفور سمجھ کر جواب دے دیا کہ میں وہ نبی نہیں ہوں۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَ ھُمْ۔

یہودیوں کے سوال پر یحییٰ علیہ السلام کا یہ جواب اور بعد کے واقعات تفسیر ہیں اس آیت قرآنی کی کہ:-

وَشَھِدَ شَاھِدٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اور گواہی دے چکا ایک گواہ بنی اسرائیل میں سے

عَلٰی مِثْلِہٖ فَاٰمَنَ وَ اسْتَکْبَرْتُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰:۴۶)	ایک ایسی کتاب کی پھر وہ یقین لایا اور تم نے تکبر کیا تحقیق اللہ ہدایت نہیں فرماتا ظالموں کی قوم کو۔

پیشینگوئی نمبر ۲ | قرآن شریف کی سورۃ الصف کے رکوع ۱ میں آیا ہے کہ :۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ	اور جب کہا عیسیٰ بن مریم نے کہ اے بنی اسرائیل میں اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف تصدیق کرتا ہوں اپنے سے پہلے کی چیز توریت کی اور خوشخبری سناتا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آویگا اُس کا نام احمد ہے "

انجیل یوحنا (۱۴: ۱۶- ۱۵: ۲۶- ۱۶: ۷) میں یہ بشارت درج ہے مگر عیسائیوں نے اِسْمُہٗٓ اَحْمَدُ کے ہم معنی الفاظ میں تحریف لفظی اور تحریف معنی دونوں سے کام لیا ہے۔ قول مسیح ان آیات اناجیل میں یہ تھا کہ :۔ "میں جاؤں گا تو تمہارے پاس فارقلیط آئے گا "۔ اس لفظ فارقلیط میں عیسائیوں نے بہت کچھ کتر بیونت کی ہے۔

فارقلیط عبرانی یا سریانی یا کلدانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ستودہ کے ہیں جو ٹھیک احمدؐ یا محمدؐ کے لغوی معنی کا ترجمہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نے اس پیشینگوئی میں یہی لفظ استعمال فرمایا تھا یوحنا نے آپ کے کلمات کا اپنی انجیل میں یونانی زبان میں ترجمہ کیا تو لفظ فارقلیط کا ترجمہ پیریکلائیط یا پیریکلیط Periclyte یا پیراکلیوط کیا جس کے معنی بھی وہی ستودہ یا احمدؐ کے ہیں مگر عیسائیوں نے ان الفاظ میں تحریف کر کے انھیں پراکلیط Paraclete سے بدل دیا جس کے معنی تسلی دہندہ Comforter کے ہیں۔ یہ تو تحریف لفظی تھی۔ تحریف معنوی اس میں یہ کی کہ اُس لفظ "تسلی دہندہ" کے معنی کو بھی بدل ڈالا اور اس سے کوئی شخص معہود و مخصوص مراد نہیں لیا۔ بلکہ روح حق اور روح القدس مراد لے کر

یوحنا (باب ۱۴ و ۱۵) میں تسلی دینے والے،، کے بعد بطور تفسیر کے (یعنی روح حق،، کے لایعنی الفاظ کو بڑھا کر داخل متن کر دیا۔

جن اناجیل کے قدیم نسخوں میں بقول عیسائی علماء ہی کے اختلافات کتابت لاکھوں تک پہنچے ہوں، جن کے چھٹی صدی عیسوی سے قبل کے نسخے سب کے سب مفقود ہو چکے ہوں، جن کے کاتبوں اور ناقلوں اور مفسروں کا یہ گمان ہو کہ اپنے مفروضہ مذہب کی تائید میں کذب و دروغ گوئی سے مدد لینا جائز ہے ان میں ذرا سے اختلاف اعراب یا ایک شوشہ کے بڑھا دینے یا گھٹا دینے سے پیریکلیط کو پراکلیط یا پاراکلیط بنا دینا کونسی بڑی بات ہے۔ مگر برنباس کی انجیل میں اس موقعہ پر پیریکلیط ہی آیا ہے جو کہ فارقلیط کا صحیح ترجمہ ہے۔ اگرچہ عیسائی اس سند کو تسلیم نہیں کرتے اور انجیل برنباس کو اب جعلی قرار دیتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ دین مسیحی کے قدیم مصنفوں نے جو کہ عام طور پر ایماندار بھی تسلیم کیے گئے ہیں اس کتاب کو صحیح اور اصلی تسلیم کیا ہے اور اس کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا ہے اور اسے خوب رواج دیا ہے اور مشہور کیا ہے۔ متاخرین میں سے جارج سیل وغیرہ نے بھی جو کہ پکے عیسائی تھے اس امر کا صاف صاف اقرار کیا ہے کہ یہ کتاب بہ تمامہ جعلی نہیں۔ جب کتاب کے سچے ہونے کا انہیں اعتراف ہے تو کسی خاص متنازع فیہ لفظ کے جعلی ہونے کے متعلق اُن کا صرف بلا دلیل بیان کافی نہیں تاوقتیکہ اپنے بیان کی تائید میں وہ کوئی ثبوت نہ پیش کریں۔ حالانکہ اب تک ان سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ وہ اپنے اس قول کی تائید میں کوئی ایک ہی قدیم مستند قلمی نسخہ انجیل برنباس کا پیش کرتے اور جعل کو ثابت کرتے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی ہے جو خاص اہمیت رکھتی ہے۔ دیگر زبانوں میں انجیل کے ترجمہ ہونے کا زمانہ عیسائی علماء نے محض اپنی اٹکل سے تیسری صدی عیسوی کا ٹھیرایا ہے مگر عربی ترجمہ کا کوئی زمانہ نہیں ٹھیرایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں انجیل کا ترجمہ اس سے قبل وجود میں آچکا تھا اور اٹکل اور قیاس کا دور اس کے بعد شروع ہوا ہے ورنہ اس کے لیے بھی کسی زمانہ کی تخصیص کر دی جاتی

بہرحال اگر انجیل کا سب سے پہلا عربی ترجمہ دوسری زبانوں کے ترجموں میں سب سے زیادہ قدیم نہ ہو تب بھی وہ بہت پرانا ترجمہ ضرور ہے اور فارقلیط کے متعلق امتیاز اہل عرب سب سے زیادہ معتبر ہے۔ جب قرآن میں وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ نازل ہوا اُس وقت ملک عرب علمائے یہود و نصاریٰ سے بھرا ہوا تھا اور ہزاروں یہود و نصاریٰ اسلام کی حقانیت کو دیکھ کر اسلام قبول کر چکے تھے۔ واقف کار لوگوں کے سامنے خلاف واقعہ امر کے اظہار پر دلیری کرنا گویا زنبوروں کے چھتے کو چھیڑ دینا ہوتا۔ اگر اُس زمانہ میں انجیل کے عربی ترجمہ میں فارقلیط کا لفظ نہ ہوتا تو تمام یہود و نصاریٰ ٹوٹ پڑتے اور شور مچا دیتے کہ یہ بات (نعوذ باللہ) غلط ہے اور انجیل میں کہیں بھی احمد (صلے اللہ علیہ وسلم) کا نام نہیں آیا اور وہ ہزاروں یہود و نصاریٰ جو اسلام قبول کر چکے تھے اسلام سے برگشتہ ہو گئے ہوتے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور سب یہود و نصاریٰ دم بخود ہو کر رہ گئے اور کسی ایک نے بھی قرآن کے اس بیان کو چیلنج نہ کیا اور غلط نہ بتایا۔ چنانچہ زمانہ مابعد تک بھی ۱۶۷۱ء میں کلیسائے روم کی طرف سے عیسائی علماء نے انجیل کا جو عربی ترجمہ چھاپا ہے اُس میں بھی فارقلیط ہی کا لفظ چھپا ہے۔ اس عربی انجیل میں یوحنا (۱۴: ۱۶) کی عبارت یہ ہے:-

وَاَنَا اَطْلُبُ مِنَ الْاَبِ فَيُعْطِيكُمْ فَارقليطا اٰخر لِيَثْبُتَ مَعَكُمْ اِلَى الْاَبَدِ[۱]

یوحنا (۱۶: ۷) کی عبارت یہ ہے:-

لٰكِنِّي اَقُولُ لَكُمْ اِنَّهُ خَيْرٌ لَّكُمْ اَنْ اَنْطَلِقَ لِاَنِّي اِنْ لَّمْ اَنْطَلِقْ لَمْ يَاْتِكُمُ الفارقليطُ فَاِنِ انطلقت اَرْسَلْتُهُ اِلَيْكُمْ۔

اور یوحنا (۱۵: ۲۶) میں بھی آیا ہے:- فَاِذَا جَاءَ فَارقليطُ الخ بائیبل کے عربی ترجمہ مطبوعہ لندن ۱۸۵۸ء میں بھی عربی کی یہی عبارتیں درج ہیں۔

---

[۱] ترجمان القرآن۔ حال میں جو عربی ترجمہ برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی نے شائع کیا ہے اس میں دونوں جگہ سے فارقلیط کا لفظ نکال کر مُعَزّی کا لفظ رکھ دیا گیا ہے جس کے معنی وہی تسلی دہندہ کے ہیں۔

اگر عیسائیوں کے اس قول کو بھی مان لیا جائے کہ فارقلیت کے بجائے صحیح لفظ پراکلیت ہے جس کے معنی تسکین دہندہ کے ہیں تب بھی یہ تسکین دہندہ رسول عربی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں کہ روح القدس کیونکہ انجیل کی زبان میں روح القدس کے لیے نازل ہونا بیان کیا جاتا ہے نہ کہ آنا دیکھو اعمال ۸: ۱۶ - ۱۰: ۴۴ - ۱۱: ۱۵) -

علاوہ بریں مسیح کی پیشینگوئی یہ ہے کہ میں جاؤں گا تب وہ آئے گا اور جب تک میں نہ جاؤں گا وہ نہ آئے گا حالانکہ روح القدس کے نزول کے لیے مسیح کے جانے کی شرط نہیں ہو سکتی کیونکہ روح القدس کا نزول مسیح کی موجودگی میں بھی ہو چکا ہے - اور مسیح سے قبل بھی تمام انبیاء علیہم السلام پر وہ روح نازل ہو چکی ہے - اور مسیح کے سامنے اور مسیح کے آسمان پہ جانے کے وقت حواریوں پر بھی اس کا نزول ہوا -

متی (۳: ۱۱) میں ہے کہ :- " وہ (یعنی مسیح) تمہیں روح القدس اور آگ سے بپتسمہ دے گا "

متی (۳: ۱۶) میں ہے کہ :- " اور یسوع بپتسمہ پا کے وہیں پانی سے نکل کر اوپر آیا اور دیکھو کہ اس کے لیے آسمان کھل گیا اور اس نے خدا کی روح کو کبوتر کی مانند اترتے اور اپنے اوپر آتے دیکھا "

یوحنا (۲۰: ۲۱ و ۲۲) میں ہے کہ :- " اور یسوع نے پھر انہیں (یعنی اپنے شاگردوں کو) کہا تم پر سلام جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے میں بھی اسی طرح تمہیں بھیجتا ہوں - اس نے یہ کہہ کے ان پر پھونکا اور کہا کہ تم روح قدس لیو " -

لوقا (۱: ۴۱) میں ہے کہ :- " اور ایسا ہوا کہ جو نہیں الیسبات نے مریم کا سلام سنا لڑکا اس کے پیٹ میں اچھل پڑا اور الیسبات روح قدس سے بھر گئی "

لوقا (۱: ۶۷) میں ہے کہ :- " اور اس کا باپ زکریاہ روح قدس سے بھر گیا " -

لوقا (۲: ۲۵) میں ہے کہ :- " اور روح قدس اس پہ (یعنی شمعون پہ) تھی "

پھر بھلا اس روح القدس کی نسبت مسیح کا وہ قول کیونکر صادق آ سکتا ہے کہ " اگر میں نہ

جاؤں تو تسلی دینے والا تم پاس نہ آوے گا پر اگر میں جاؤں تو میں اُسے تم پاس بھیجوں گا،، (یوحنا ۱۶:۷) وہ تسلی دینے والے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں جن کا آنا مسیح علیہ السلام کے جانے پر موقوف تھا۔ اقوال مسیح میں انجیل میں آنے والے فارقلیت یا تسلی دہندہ کے متعلق بالتخصیص پانچ باتیں بیان کی گئی ہیں :۔

(۱) وہ دوسرا تسلی دینے والا ہوگا جو آئے گا (یوحنا ۱۴:۱۶) یعنی مسیح سے غیر ہوگا۔ اگر عیسائی عقیدہ کی رو سے باپ بیٹا اور روح القدس ایک ہی چیز ہیں، اور تسلی دینے والے سے روح القدس مراد لی جاتی ہے تو وہ تسلی دہندہ دوسرا کیونکر ہو سکتا ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ روح القدس نہیں ہے جو یہاں مقصود ہے بلکہ مسیح علیہ السلام کی طرح ایک پیغمبر ہیں جن کی بشارت دی جا رہی ہے

(۲) وہ مسیح کے جانے کے بعد آوے گا نہ کہ مسیح کی موجودگی میں (یوحنا ۱۶:۷) اس سے بھی یقین ہوگیا کہ وہ روح القدس یا روح حق نہیں جیسا کہ اوپر بیان گزر چکا ہے۔ جو لوگ روح حق اور روح القدس کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں غلطی پر ہیں کیونکہ بعض قابل ترجمہ کرنے والوں نے روح حق کا ترجمہ راستی کی روح اور صداقت کی روح کیا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جن فارقلیت یا تسلی دہندہ کی بابت پیشینگوئی کی گئی ہے وہ صداقت اور راستی ہی کی روح لے کر آئے۔

(۳) وہ مسیح کے لیے گواہی دیں گے (یوحنا ۱۵:۲۶) - اور مسیح کی بزرگی کریں گے (یوحنا ۱۶:۱۴) - آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا دوسرے کسی نبی نے مسیح علیہ السلام کے پیغمبر ہونے کی شہادت نہیں دی اور کسی اور نبی نے آپ پر سے یہودیوں اور نصرانیوں کے لگائے ہوئے اتہامات کو دور کر کے آپکی بزرگی کوشش نہیں کیا۔ یہودیوں نے جو آپ کی ولادت کے متعلق آپ کی شان اور آپ کی والدہ ماجدہ کی شان میں بیہودہ بکواس کی تھی اُس کی نہایت زبردست تردید رسول عربی ہی نے کی۔ عیسائیوں نے جو آپ کی تعلیم کو تثلیث سے مسخ کیا اُس کی بھی نہایت زبردست تردید رسول عربی ہی نے کی۔ پھر عیسائیوں نے افسانہ صلیب

تصنیف کرکے آپ کے حق میں جس ذلت کی موت کو شہرت دی اُس کی غلطی کا اظہار بھی رسول عربی ہی نے فرمایا۔ پولوس جو کہ اپنے آپ کو بہت بڑا مسیحی کہتا ہے گلیتون (۳ : ۱۳) میں لکھتا ہے کہ :۔

"مسیح نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کہ وہ ہمارے بدلے میں لعنت ہوا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے"

مگر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کو پکار پکار کر اللہ تعالیٰ کا یہ اعلان سناتے ہیں کہ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ۔ مختصر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اور آپ کی بزرگی اور برگزیدگی کی تائید میں جو شہادت آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی وہ نہ یہودیوں کی جانب سے کبھی پیش ہوئی نہ خود عیسائیوں کی جانب سے۔ باوجود اس کے عیسائی علماء مسیح کی پیشینگوئی کا آپ کو مصداق قرار دینے میں بخل کرتے ہیں۔

(۴) وہ اپنی نہ کہیں گے لیکن جو کچھ وہ سنیں گے وہی کہیں گے (یوحنا ۱۶ : ۱۳) یہ پورا پورا ترجمہ ہے اس آیہ مبارکہ کا کہ :۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ یہ وہی تعریف ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں فرمائی ہے۔

(۵) وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گے (یوحنا ۱۴ : ۱۶) ہمیشہ یعنی قیامت تک وہ اور اُن کا مذہب اور اُن کی ہدایت اور اللہ کا جو کلام اُن پر نازل ہوگا اور کلمات ہدایت جو اُن کی زبان سے نکلیں گے تمہارے ساتھ رہیں گے۔ یعنی پھر قیامت تک کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہ ہوگی اور وہ نبی آخر الزمان ہوں گے اور اُن کی شریعت کی، قرآن کی، حدیث کی، آخر تک محافظت کی جائے گی اور توریت و انجیل و اقوال انبیاء کے ساتھ لوگوں نے جو سلوک ازراہِ تحریف و الحاق کیا ہے وہ قرآن و حدیث کے ساتھ نہ ہو سکے گا اور ایک جماعت حق پر ہمیشہ قائم رہے گی۔

مختصر یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کی یہ پیشینگوئی سوا رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی اور پر صادق

آ ہی نہیں سکتی۔

بعض عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے کہ اگر فارقلیط سے نبی عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی مراد ہیں تو اس پیشینگوئی کے پورا ہونے میں چھ سو برس کا وقفہ کیوں ہوا؟ ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ توریت مزبور وغیرہ میں جو پیشینگوئیاں عیسائیوں کے نزدیک عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق ہیں ان کے پورا ہونے میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس کا وقفہ کیوں واقع ہوا؟ - عیسائیوں ہی کی ایک کتاب میزان الحق مطبوعہ لدھیانہ ۱۸۶۲ء کے صفحہ ۲۴۳ پر یہ عبارت درج ہے کہ :-

"کئی سو پیشینگوئیاں (توریت) میں بیان ہوئی ہیں اور وقوع واقعات سے سو سو اور ہزار ہزار سال پہلے خبر دی گئی اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں اور پھر وے سب پوری ہو کر صادق آئی ہیں"

بعض عیسائی علماء کا یہ قول ہے کہ عروج مسیح سے دس دن بعد پینٹی کاسٹ کی جو ضیافت ہوئی اس میں یہ روح القدس نازل ہوئی اور اس طرح مسیح کی پیشینگوئی عروج مسیح کے دس ہی دن بعد پوری ہو گئی - اس ضیافت کا حال کتاب اعمال کے باب دوم میں درج ہے مگر اس بیان میں نہ کہیں فارقلیط کا لفظ آیا ہے نہ تسلی دینے والے کا نہ یوحنا کی پیشینگوئی کا کچھ ذکر ہے جس کا پورا ہونا اس ضیافت میں بیان کیا جاتا ہے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انجیل یوحنا واقعہ پینٹی کاسٹ کے ستر (۷۰) برس بعد لکھی گئی اگر ستر (۷۰) برس قبل پیشینگوئی پوری ہو چکی ہوتی تو وہ اپنی انجیل میں ضرور لکھ دیتا کہ فلاں پیشینگوئی فلاں دن یا فلاں موقع پر پوری ہو گئی - مگر اس نے تو پینٹی کاسٹ تک کا ذکر نہیں کیا۔ فارقلیط کی آمد کا ذکر تو بڑی بات ہے۔

اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ ضیافت پینٹی کاسٹ کے بعد بھی عیسائی لوگ فارقلیط کی آمد کے منتظر رہے اور اب تک منتظر ہیں مگر آج کل ان کا انتظار اسی نوعیت کا ہے جس

نوعیت کا انتظار یہودیوں کو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اب تک چلا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے فارقلیط ہونے کے جھوٹے دعوے بھی کئے چنانچہ سنہ ۱۷۱ء میں مونٹانس نے بھی فارقلیت ہونے کا دعوے کیا اور چند فاضل اور لکھے پڑھے لوگوں کی جماعت بھی اُس کی پیرو بن گئی۔ اگر اُس زمانہ میں بھی علماء اور عوام کا یہ خیال ہوتا کہ مسیح کی پیشینگوئی صرف نزولِ روح القدس سے متعلق ہے تو مونٹانس جو کہ ایک انسان تھا فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیسے کرتا اور لوگ اُس کے پیچھے کیوں ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ خواص و عوام ایک انسان کے منتظر تھے جو فارقلیط کے اوصاف سے مزین ہو۔ گاڈفرے ہگنس ایک فاضل عیسائی ہیں جو اپنی کتاب اپالوجی مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء میں فارقلیط کے مسئلہ پر نہایت تفصیل اور فاضلانہ بحث کرتے ہیں۔ وہ علاوہ مونٹانس کے اور بھی لوگوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے فارقلیط ہونے کا جھوٹا دعوے کیا اور جماعتیں بنالیں۔ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ:۔

”مسلمان یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مشہور بات ہے کہ بہت سے عیسائیوں کو بموجب پیشینگوئی کے ایک شخص کا انتظار تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو بناوٹ رومی پادریوں اور پروٹسٹنٹوں نے قوانین مذہبی کی اُس عبارت پر کرلی وہ عام نہ تھی۔“

پھر آگے چلکر ایک موقع پر گاڈفرے ہگنس تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

”عیسائی اپنے آپ کو اندھا کرنے کے لیے اس خیال کو کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شخص موعود تھے جس قدر چاہیں مضحکہ میں ڈالیں مگر اس سے یہ حقیقت نہ بدلیگی کہ پندرہ کروڑ اشخاص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسا ہی خیال کرتے تھے اور اب بھی خیال کرتے ہیں۔ میں نے کتابوں میں دیکھا ہے کہ جب چالیس ہزار مفسر قرآن کی تفسیر کر رہے تھے تو خیال نہ کیا جا سکتا تھا کہ ہر ایک چیز جو اہل عرب کے ہنر اور دانائی سے ایجاد ہو سکی ہو نہ کی گئی ہو۔ یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ لفظ

فارقلیط کے باب میں بحث کما حقہ نہ ہوئی ہو۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا اور نہ کیا جائے گا کہ دنیا کے معاملات کو ایک نہایت عجیب طور پر عیسیٰ (علیہ السلام) کے مذہب محرف کے لیے ایک مصلح کی حاجت تھی اور غالباً کروڑوں نے ان لوگوں میں سے جو محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مانتے تھے ہماری انجیل اور قوانین کے لفظوں کو روح قدس کی بابت کبھی نہ سنا ہوگا اور اگر سنا بھی ہوگا تو ان کی تصدیق سے انکار ہوگا مگر انھوں نے اگر تسلیم بھی کیا ہو تو ایک مختصر جواب رغبت سے سننے والوں کا اطمینان کردے گا۔ وہ یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ عہد جدید میں ہدایت ہے کہ روح الصدق آوے گی۔ یہ درست ہے کہ روح الصدق آئی مگر محمد (رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آئی جن کو روح الصدق سے الہام ہوتا تھا۔ پس یہی تمہاری پیچیدہ عبارت کے صحیح معنی ہیں اور صرف یہی درستگی کے ساتھ ہو سکتے ہیں"۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

سورۃ البقرہ

(۲)

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

ایمان کے لیے کفر سے برأت اور بیزاری شرط ہے

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ روحہ و نور ضریحہ و متعنا بعلومہ و برکاتہ اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں :-

ایمان عبارت از تصدیق قلبی است
بانچہ از دین بطریق ضرورۃ و تواتر بما رسیدہ است
و اقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط دارد
و علامت ایں تصدیق تبری است از کفر و بیزاری از
کافری و آنچہ در کافری است از خصائص و لوازم آن
ہمچناں بستن زنار و مثل آن و اگر عیاذاً باللہ سبحانہ
با دعوای این تصدیق تبرا از کفر ننماید مصدق دین نیست
است کہ بداغ ارتداد متسم است و فی الحقیقت حکم او

ایمان ان چیزوں کی تصدیق قلبی کا نام ہے جو
امور دین سے بطریق بداہت و تواتر ہم تک پہنچی
ہیں - علماء اقرار لسانی کو بھی ایمان کا رکن بتلاتے
ہیں مگر یہ رکن بعض حالات میں مثلاً حالت اکراہ و لجا
میں ساقط ہو جاتا ہے - کفر اور کافری اور اس کے
خصائص و لوازم جیسے زنّار باندھنا ان سب سے تبری
اور بیزاری ایمان اور تصدیق کی علامت ہے اور اگر
کوئی شخص باوجود اس تصدیق کا دعوی کرنے کے کفر سے

حکم منافق است لا الی هٰؤلاء ولا الی هٰؤلاء پس در تحقیق
ایمان او تبری کفر چاره نبود و ادنای آن تبری قلبی است
و اعلاے آن تبری قلبی و قالبی و تبری عبارت از دشمنی
است با دشمنان حق جل و علا آں دشمنی خواه بالقلب
بود اگر خوفی از ضرر ایشان داشته باشد خواه بالقلب
و قالب هر دو در وقت عدم آن خوف اگر میسر
یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْکُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ
وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ مؤید این معنی است چه محبت
خداے عز و جل محبت رسول او علیه و علی آله الصلوٰة
و التسلیمات بے دشمنی دشمنان صورت نه بندد ع

تولّیٰ بے تبرّیٰ نیست ممکن

این جا صادق است ۔

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علی نبینا و علیه الصلوٰة
و السلام اینهمه بزرگی که یافت و شجرهٔ انبیا گشت
بواسطه تبری از دشمنان او تعالیٰ بوده. قال الله تعالیٰ
قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهِیْمَ
وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا
مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا
بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ

تبری اور بیزاری نہ ظاہر کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی
تصدیق کرنے والا ہی جو داغ ارتداد سے آلودہ ہے اور حقیقت میں
شخص منافق کے حکم میں ہے نہ اِدھر نہ اُدھر پس ایمان کے ثابت کرنے کے
لیے کفر سے تبری ضروری اور لابدی ہے جس کا ادنی مرتبہ یہ ہے کہ
دل سے تبری اور بیزاری ہو اور تبری کا اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ
وہ تبری قلب اور قالب یعنی زبان اور دل ظاہر اور باطن دونوں سے ہو
اور تبری کے یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کے دشمنوں کے
ساتھ دشمنی کرنا خواہ وہ دشمنی فقط قلب سے ہو اگر کافروں
کے ضرر کا اندیشہ ہو اور خواہ قلب اور قالب یعنی زبان
اور دل دونوں سے وہ دشمنی ہو جبکہ ان کے ضرر کا کوئی
اندیشہ نہ ہو اور یہ آیت کریمہ (اے نبی تم کافروں اور
منافقوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو) اس معنی کی
مؤید ہے اس لیے کہ خدائے عز و جل اور اس کے
رسول کی محبت اُس کے دشمنوں سے عداوت اور دشمنی
کے بغیر متصور اور ممکن نہیں (مصرع)

تولّیٰ بے تبرّیٰ ہو نہیں سکتا

یہاں بالکل راست آتا ہے ۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا و علیہ الصلوٰة
والسلام نے یہ جو کچھ بزرگی پائی اور شجرہ انبیاء ہوئے

اَبَدًا حَتّٰی تُؤمِنُوا بِاللہِ وَحدَہٗ ۔
(مکتوبات دفتر اول صفحہ ۳۲۵ مکتوب ۲۶۶)

یہ سب حق تعالیٰ کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری ہی کی وجہ سے اُن کو حاصل ہوئی حق تعالیٰ فرماتے ہیں تحقیق تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں میں اسوۂ حسنہ ہے جبکہ اُنھوں نے اپنی قوم سے یہ کہا کہ ہم بالکل بری ہیں تم سے اور ان چیزوں سے جن کی تم پرستش کرتے ہو سوائے خدا کے اور ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں اور ظاہر ہو گیا ہمارے اور تمہارے درمیان میں عداوت اور بغض ہمیشہ کے لیے تاوقتیکہ تم تصدیق کرو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی۔

یہ آیتیں سورۂ ممتحنہ کی ہیں۔ یہ سورت بظاہر اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی ہے حاطب بن ابی بلتعہ، جو صحابۂ بدریین اور مہاجرین میں سے ہیں ان کے اہل و عیال مکہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے متعلقین کی حفاظت کی خاطر اہل مکہ کو ایک خط لکھ کر خفیہ طور پر روانہ کیا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس راز کی خبر دی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل مکہ پر حملہ کا ارادہ فرما رہے ہیں آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی کے اس خط کی اطلاع ہو گئی اور وہ خط پکڑا گیا۔ حاطب بلائے گئے تو آپ نے یہ عذر کیا کہ یا رسول اللہ قسم ہے عالم الغیب والشہادہ کی یہ فعل میں نے مسلمانوں کی بدخواہی کے خیال سے نہیں کیا۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ مہاجرین کی تو مکہ میں قرابت اور رشتہ داری ہے اس قرابت کی وجہ سے اُن کے مال و اولاد مکہ میں محفوظ ہیں مگر اہل مکہ سے میری کوئی قرابت نہیں میں دوسری جگہ کا باشندہ ہوں اس لیے میں نے یہ چاہا کہ ظاہری طور پر اہل مکہ کے ساتھ احسان کروں تاکہ اس صلہ میں وہ میرے اہل و عیال کی حفاظت کریں۔ باقی اس کا مجھکو یقین کامل ہے کہ اللہ ہی کا کلمہ بلند ہوگا اور اس کا رسول ہی مظفر و منصور اور فتحیاب ہوگا اور اس کا سچا دین ہی سب دینوں پر غالب ہوگا۔ میرے اس خط سے اسلام کا تو ذرہ برابر کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور میرا ایک کام نکل آئے گا۔ اس پر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کی طرف مخاطب ہو کر یہ ارشاد فرمایا:۔

اِنَّہٗ قَد صَدَقَکُم (بخاری صفحہ ۲۶۶) یقیناً اس نے بلاشبہ تم سے سچ کہا ہے۔

اس پر یہ سورت نازل ہوئی :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ تُلْقُونَ إِلَيْهِم بِالْمَوَدَّةِ

اے مومنو تم میرے اور اپنے دشمنوں کو ہرگز مت دوست بناؤ کہ تم ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو۔

حاطب بن ابی بلتعہ مہاجری اور بدری ہونے کی وجہ سے بلا شبہ جنتی اور بہشتی ہیں، بمقتضائے بشریت اُن سے یہ لغزش ہوگئی، اور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے نہایت تاکیدی الفاظ کے ساتھ اُن کا صادق العذر ہونا بھی بیان فرما دیا، یعنی انہ قد صدقکم میں ان کے صدق کو دو حرف تحقیق ایک انّ اور دوسرے قد کے ساتھ ظاہر فرمادیا۔ مگر باہمہ حق تعالیٰ شانہٗ کو کفار کے ساتھ اُن کی یہ محض ظاہری اور صوری مؤلاۃ ناپسند ہوئی اور یہ سورت نازل فرما کر بتلا دیا کہ کفار کے ساتھ یہ صوری اور ظاہری موالاۃ بھی نہ چاہیئے بلکہ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرح کفار سے تبری اور بیزاری اور بغض اور عداوت کا اعلان ضروری اور لازم ہے یہ سورت اول سے آخر تک خدا کے دشمنوں سے تبری اور بیزاری ہی کے احکام پر مشتمل ہے۔ قال تعالیٰ :-

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ۔

کیا تو نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعوے کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا ہے اور اس پر جو تجھ سے پہلے اتارا گیا تھا، مگر چاہتے ہیں کہ اپنا معاملہ فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں۔ حالانکہ اُن کو حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں۔

اس آیت شریفہ سے صراحتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصدیق کے بعد طاغوت کے ساتھ کفر اور اس کی تکذیب اور اس سے برارت اور بیزاری کا بھی حکم ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار۔ آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَفَرْتُ بِالطَّاغُوتِ (تصدیق کی

ہیں نے اللہ کی اور تکذیب کی ہیں نے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوفناک چیز سے محفوظ رہیگا۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمر) حصن حصین صد ۶۷

اس حدیث شریف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا منشار مبارک یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں سے برات اور بیزاری قلب میں ایسی راسخ ہو کہ ایسی غفلت کے وقت میں بھی اس سے ذہول اور غفلت نہ ہونے پائے۔

وقال تعالیٰ شانہ

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (سورہ مومن)

جب انھوں نے ہماری قوت کا مظاہرہ دیکھا تو پکار اُٹھے کہ ایمان لائے ہم خدائے واحد پر اور کفر کیا ہم نے اُن چیزوں سے جن کو ہم شریک کرتے تھے۔ مگر ہماری قوت کا مظاہرہ دیکھنے کے بعد ان کا ایمان لانا ان کے لیے ہرگز نافع نہ ہوا۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس کے بندوں میں رہی ہے۔ چنانچہ اس جگہ کافر نامراد ہوئے۔

اس آیت شریفہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری اگر مشاہدہ عذاب سے پہلے کرتے تو وہ ان کے لیے مفید اور نافع ہوتی مشاہدۂ عذاب کے بعد اب اس کا وقت نہیں رہا۔

حق جل شانہ نے قرآن کریم میں جا بجا مہاجرین کی جو ثنا و تعریف فرمائی ہے وہ بھی اسی تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں اپنے وطن مالوف اور آباء و ابناء اور اخوان و خلان اور ازواج و قبائل سب ہی سے الگ ہو گئے اور علیٰ ہذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا نمایاں نہیں کہ اسکی جانب اس منقبت کبریٰ اور نعمت عظمیٰ کو منسوب کیا جا سکے۔ اصحاب کہف کو یہ تمام درجات و فضائل صرف دشمنان حق جل و علیٰ سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے ہیں۔

غلبۂ اعدا اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کی معمولی نقل وحرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے بخلاف زمانۂ امن وسکون کے کہ اُس وقت کی غیر معمولی نقل وحرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانۂ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل ہے۔ اس لیے کہ زمانۂ شباب میں دشمنان دین یعنی نفس امّارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے۔ دشمنان دین کے مقابلہ ہی کی وجہ سے زمانۂ شباب کی عبادت پر عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے کہ جس دن سوائے عرش رحمن کے سایہ کے کوئی سایہ نہ ہوگا۔ اس عظیم الشان مسئلہ کے متعلق دل چاہتا ہے کہ کچھ اور لکھا جائے مگر اس اندیشہ سے کہ یہ تطویل موجب ملال نہ ہو اس لیے اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

اندکی پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیارست

ایمان کی صورت اور اسکی حقیقت حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے۔ اور اطمینان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہوجانا یہ ایمان کی حقیقت ہے۔ اطمینان نفس سے یہ مراد ہے کہ مقتضائے شریعت مقتضائے طبیعت بن جائے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے:۔

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ	تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ
تبعا لما جئت بہ	اسکی طبعی خواہش میری شریعت کے تابع نہ ہوجائے

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہوجائے کہ اللہ اور اس کے رسول کا ہر حکم اُس کو لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اسکی معصیت اور نافرمانی کا ادنیٰ سا خیال اور معمولی سا وسوسہ بھی آگ میں جلنے سے بدرجہا زائد اسپر شاق اور گراں ہو۔ ایمان کی اسی کیفیت اور حالت کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ذاک صریح الایمان (یہی کھلا ہوا ایمان) فرمایا ہے۔

حاشا وکلا نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز یہ مراد نہیں کہ معصیت کا وسوسہ صریح ایمان ہے ورنہ ہم فاسق اور بدکاروں کے ایمان کا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ایمان سے زیادہ صریح اور جلی ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ ہمارے نفوس تو ہروقت اسی معصیت کے لیے جولانگاہ بنے رہتے ہیں بلکہ معصیت کے وسوسہ اور خیال کا قلب پر اس درجہ شاق اور گراں ہونا کہ آگ میں جل جانا اس سے آسان معلوم ہو معصیت کی اسی گرانی اور ناگواری کو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صریح ایمان فرمایا ہے۔ قال تعالیٰ :-

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ۔

اس وجہ سے کہ انھوں نے اُس چیز کا اتباع کیا جو خدا کی ناراضی کی موجب ہے اور خدا کی رضامندی کو مکروہ سمجھا اور اس سے نفرت کی۔ حق تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال حبط کر دیئے۔

پس جس طرح خدا کی رضا اور اطاعت سے کراہت اور ناگواری اور اس سے نفرت تمام اعمال کو حبط کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کی معصیت اور اسکی نافرمانی کی کراہت اور اس کے وسوسہ اور خیال ہی سے نفرت اور بیزاری ایمان کو صریح اور روشن اور جلی بناتی ہے۔ اس قسم کا ایمان خاص صحابۂ کرام علیہم الرحمۃ والرضوان کا حصہ تھا جس کو حق جل شانہ نے بطور امتنان ذکر فرمایا ہے :-

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ نِعْمَةً وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔

اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول ہے اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری بات مانے تو تم مشقت میں پڑ جاؤ لیکن اللہ نے تمہاری طرف ایمان کو محبوب بنا دیا اور تمہارے دلوں میں اسکو مزین کر دیا اور کفر اور فسق اور نافرمانی کی کراہت اور طبعی ناگواری تمہارے دلوں میں ڈال دی ایسے ہی لوگ بھلائی پانیوالے ہیں محض اللہ کے فضل اور احسان سے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے

حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ اس سوراخ میں اژدہا ہے تو ہرگز اُس میں انگلی نہ ڈالے گا۔ اور اگر کوئی شخص سوراخ پر انگلی رکھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو اژدہے کے وہاں ہونے کا یقین نہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ اس معصیت اور اس گناہ سے جہنم کے سانپ اور اژدہے اس کو ڈسیں گے تو پھر اس سے معصیت کا صدور ناممکن اور محال ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی معصیت کرتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خدا کی وعید اور عذاب پر پورا یقین نہیں۔

حدیث میں ہے کہ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن۔ زانی ہرگز زنا نہیں کرسکتا جبکہ وہ مومن ہو۔ یعنی اگر اُس کو اس عذاب الٰہی اور عقاب خداوندی کا جو زنا کاروں کے لیے مقرر ہے پورا پورا یقین اور کامل اطمینان اور انکشاف ہو جائے تو پھر اس سے زنا کا صادر ہونا ناممکن اور محال ہے۔

اور حدیث میں ہے کہ اذا زنی العبد خرج منہ الایمان بندہ جب زنا کرتا ہے تو ایمان نکل جاتا ہے۔ اس حدیث میں ایمان سے اسی یقین اور اطمینان کا زائل ہونا مراد ہے۔ اور حق جل شانہٗ کے اس ارشاد میں:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اسکے رسول پر

ایمان اول سے تصدیق قلبی مراد ہے اور دوسرے ایمان سے ایمان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا مراد ہے۔ **کما قال تعالیٰ** یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً۔

حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے فضل عمیم سے ایمان بمعنی یقین واطمینان کو نجات کا مدار نہیں قرار دیا بلکہ اپنی بے پایاں رحمت سے ایمان کی صورت یعنی تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ہی کو قبول فرمایا اور فقط تصدیق قلبی اور اقرار لسانی پر جہنم سے نجات اور دخول بہشت کا وعدہ فرمایا۔ ہاں تقرب اور وصول الی اللہ کا مرتبہ بغیر اطمینان نفس اور یقین کامل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔

ایمان صوری اور ظاہری اگرچہ ایمان حقیقی کے لحاظ سے بہت معمولی اور ادنیٰ شے ہے مگر

کفر اور شرک کے اعتبار سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود ورنہ بس عالیست پیش خاک تود

اسی وجہ سے حدیث میں ہے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق

جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ داخل ہوا جنت میں اگرچہ زنا اور چوری کرے۔ معاذ اللہ اس حدیث سے زنا اور سرقہ کی اجازت اور اباحت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اے لوگو! تم کسی طرح لا الٰہ الا اللہ کہہ کر کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ۔ زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں مگر کفر اور شرک کے سامنے یہ تمام کبائر اور فواحش سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہ مرض اور بیماری ہے مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں صحت اور عافیت ہے۔ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن اور اذا زنی العبد خرج منہ الایمان میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے بخار کی طرح زنا کا فی حد ذاتہ مرض ہونا بیان فرمایا۔ ومن قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق میں زنا اور سرقہ کا کفر اور شرک کے لحاظ سے ناقابل التفات ہونا بیان فرمایا ہے۔ یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابو سفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات دریافت کیے تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کیا کوئی شخص آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد آپ کے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ ابو سفیان نے کہا نہیں۔ اس پر ہرقل نے کہا:

وَکَذٰلِکَ الْاِیْمَانُ حِیْنَ تُخَالِطُ بَشَاشَتُہٗ القلوب (بخاری شریف) — ایمان کی یہی حالت ہے جب اس کی بشاشت اور فرحت اور مسرت قلوب میں سرایت کر جاتی ہے۔

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان نفس اور انشراح صدر مراد ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہی حقیقی ایمان ہے جس کے بعد انسان کا مرتد ہونا ناممکن اور محال ہے۔ صوری اور مجازی ایمان کے بعد مرتد ہونا

ممکن ہے مگر حقیقی ایمان کے بعد مرتد ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کرام کا ارشاد ہے:۔

اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَجَعَ مِنَ الطَّرِیْقِ، یعنی جز این نیست کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے۔ منزل مقصود پر پہونچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے اور اس دعاء ماثور اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَا یَرْتَدُّ (اے اللہ میں تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہوسکے) میں اسی خاص ایمان کی طرف اشارہ ہے ورنہ ایماناً کے بعد لا یرتد کی قید لگانے کی کیا حاجت تھی۔

علامہ نظام الدین نیشاپوری اپنی تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی۔ دوسرا وجود ذہنی۔ تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی ہے۔ جب بندہ اور خدا تعالیٰ میں حجابات مرتفع ہوجائیں، اس وقت مومن کے قلب میں ایک نور حاصل ہوتا ہے وہی نور ایمان کا وجود عینی ہے کما قال تعالیٰ:۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ آمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَی النُّوْرِ — اللہ دوست ہے اُن لوگوں کا جو ایمان لائے نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اسکو شرح صدر ہوجاتا ہے اور نبی کریم اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا صدق اس کے نزدیک آفتاب سے زائد بدیہی اور روشن اور جلی ہوجاتا ہے کما قال تعالیٰ:۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَھُوَ عَلٰی نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ — جس شخص کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔

اور یہی نور قیامت کے دن صراط پر رہنمائی کریگا۔ کما قال:۔

نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ — ان کا نور ان کے سامنے اور دائیں جانب دوڑتا ہوگا۔

ایمان کا نورٌ علیٰ نورٍ ہونا اہل ایمان قیامت کے دن محسوس کریں گے اور جو لوگ اس دار دنیا میں نور ایمان سے محروم اور ظلمات کفر میں گھرے ہوئے ہیں وہ قیامت کے دن بھی اس نور سے محروم رہیں گے

کما قال تعالیٰ:-

وَمَنْ لَّمْ یَجْعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوْرًا فَمَا لَہٗ مِنْ نُّوْرٍ جسکو خدا نے نور نہیں دیا پھر اسکے لیے کہیں نور نہیں۔

قیامت کے دن تو ایمان کا نور ہونا سب ہی کو معلوم ہوجائے گا مگر اس دار دنیا میں جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو ایمان رویائے صالحہ یا کشف سے مکشوف ہوا ہے تو وہ نور ہی کی شکل میں مکشوف ہوا۔

فلسفی کو منکرِ حنانہ است — از حواس انبیاء بیگانہ است

اور اس نور کا مطالعہ اور تصور یہ ایمان کا وجود ذہنی ہے اور لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دینا یہ ایمان کا وجود لسانی ہے۔ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر اس نور کے مفید اور کارآمد نہیں۔ جیسا کہ پیاسے کے لیے آب زلال کا فقط تلفظ کافی نہیں جب تک کہ اُس سے سیراب نہ ہو باقی

حاملانِ قرآن

حضرت داؤد عمادیؒ

(جناب مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی، ایس سی، علیگ)

اُولٰئِكَ اٰبَائِیْ فَجِئْنِیْ بِمِثْلِهِمْ
اِذَا جَمَعَتْنَا یَا جَرِیْرُ الْمَحَافِلُ

نہایت متبحر علامہ، صاحب الفضل والکرامہ، علوم قرآن وحدیث میں یگانہ، ادب ولغت میں یکتائے زمانہ، تفقہ فی الدین میں فرد کامل، استنباط احکام میں مشار بالانامل۔

اسم شفا ایک شخص کو حضرت سے انکار تھا اور اس میں سخت اصرار تھا، ایک شب درد شکم میں مبتلا ہوا جس قدر تدبیریں کی گئیں درد بڑھتا ہی گیا، اُسی گھر میں حضرت کے ایک ارادت مند بھی فروکش تھے، عجز طبیب وبیقراری مریض پران کو رحم آیا۔ درد مند کو سیدھا لٹایا، بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلٰوةُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ کے بعد "حضرت سید داود طعام بانی ہضم" کہتے جاتے تھے اور اس کے شکم پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے، چند دقیقے میں درد جاتا رہا اور شفا ہو گئی، یہ کلمات اُسی زمانہ سے آل عماد میں معمول بہا ہیں اور ہزار بار تجربہ میں آچکے ہیں۔

مزار مبارک رود دلیصو سے کسی زمانہ میں میرزا جیون بیگ نے ایک آبگیر نکالی تھی جسے "پوکھر" کہتے ہیں، اس کے دہانہ پر ایک مزرعہ ہے جو بہرہ آب ہونے کے باعث بہرہ مشہور تھا اور اب اسی کو سوتیت سے

اِشباع کے ساتھ پھارہ بنا دیا ہے، بہرہ و آبگیر کے مابین ایک افتادہ و بلند قطیعہ ہے جس کے گوشہ میں حضرت محو خواب ہیں اور وہ ہیں حضرت قطب بھی آسودۂ استراحت ہیں، رضی اللہ عنہما۔

مجلس درس | مجلس درس ایک خبار دریس میں ہوتی تھی جس کا اثاث تک مدرس تھا، بیرون خبار کچھ برقع پوش نیک عورتیں بھی سماعت درس کے لیے حاضر تھیں اور حاضرین کی خواہش تھی کہ ان جواہر لآلی سے کسی کے دامان گوش خالی نہ رہیں، افتتاح خطاب کے ساتھ ہی ایک صاحب نے عرض کی:۔ یا حضرت ان نیچی نظر والوں کو اونچا سنائی دیتا ہے، کوئی اطرش ہے کوئی بہرا، کوئی حسِّ سمع سے بے بہرہ، لہٰذا ضروری ہے کہ صوت خطاب جہوری ہو۔ فرمایا:۔

کوئی گونگا ہے نہ بہرا۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنفُسُكُمْ أَمْرًا۔

حُزنِ یعقوب | بہانہ جویوں کو موقع مل گیا، فوراً بول اُٹھے:۔ یا حضرت، اسی کے بعد جو آیت ہے اس میں حضرت یعقوب ع کا برا حال دکھایا ہے کہ فراق یوسف ع میں اُنکی آنکھیں جاتی رہیں، اندھے ہوگئے، یہ تو پیغمبروں کی شان نہیں۔

لِاَنَّ هٰذا اظهارٌ للجزع، وجارٍ مجری الشكاية من الله، واللّٰه لا يحسن بالانبياء الذين يجب عليهم ان يفوضوا امورهم الى اللّٰهِ فى البأساء والضرّاء وحين البأس۔	یہ تو جزع و فزع کا اظہار ہے، اس سے تو اللہ کی شکایت نکلتی ہے۔ پیغمبروں کے لیے یہ مناسب نہیں، اُن پر تو یہ لازم ہے کہ رنج و غم و ضرر و زحمت ہر حال میں اپنے تمام معاملات کو اللہ ہی کے سپرد کیے رکھیں۔

فرمایا، پوری آیت یوں ہے:۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰاَسَفٰى عَلٰى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ	یعقوب ع نے اپنے بال بچوں سے منہ موڑ لیا اور کہا: یوسف پر ہائے افسوس، اور رنج سے یعقوب ع

كَظِيْمٌ ۔ قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ	کی دونوں آنکھیں سفید ہوگئیں ۔ بایں ہمہ وہ غم
حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهَالِكِيْنَ	کو کھائے اور رنج کو دبائے رہتے، سب نے کہا، تو
قَالَ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْ اِلَى اللّٰهِ وَاَعْلَمُ	یوسف کو یاد کرنے سے باز نہ آئے گا جب تک کہ تیرے
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ، يَا بَنِيَّ اذْهَبُوْا	جسم و عقل میں فساد نہ آئے یا تو ہلاک ہونے والوں
فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَيْاَسُوْا	میں داخل ہو جائے، یعقوبؑ نے کہا میں تو صرف
مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يَيْاَسُ مِنْ رَّوْحِ	اللہ ہی کی جناب میں اپنی شکایت اور اپنے رنج
اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ،	کو پیش کرتا ہوں اور اللہ کی نسبت جتنا میں جانتا

ہوں تم نہیں جانتے، اے میرے بچو، جاؤ جاکے یوسف اور اس کے بھائی کی آہٹ لو، اللہ کے فضل سے ناامید نہ ہو، اللہ کے فضل سے بجز ان لوگوں کے جو کافر ہیں اور کوئی ناامید نہیں ہوتا۔

فرمایا۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ واللہ اکبر

کیا غم ہے مزہ کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

فراق میں نالہ، رنج و غم اللہ کے حوالہ، کلام اللہ کی یہی آیتیں یعقوب علیہ السلام کی کیا کیا شانیں دکھاتی ہیں ؏

با خدا باش ہر چہ خواہی کن

اللہ تعالیٰ نے انھیں کظیم فرمایا ہے یعنی رنج و غم سے زار و نزار تھے : اسپر بھی نہ بے صبر تھے نہ بے قرار تھے۔

عرض حال کرتے ہیں تو اسی معبود مطلق سے، استغاثہ ہے تو خدائے برحق سے ۔ مخلوق سے استعانہ غیر اللہ سے سروکار، نبوت کی بارگاہ ہے جہاں اللہ ہی اللہ ہے،

اللہ کے فضل پر اتنا وثوق ہے کہ یوسف کی سنائی سبھی سناتے ہیں مگر وہ کسی پر یقین نہیں لاتے

دفور فضل کی فراوانی بحر کرم کی بے پایانی پر جس کی نظر ہو وہ کسی بات سے کیوں مضطر ہو۔
سالہا سال گزر چکے ہیں گم گشتہ کا نشان تک مفقود ہے پھر بھی اللہ کے فضل سے نا امید نہیں ہوتے۔ ع

نومید مشو کہ نا اُمیدی کفر است

لان الیاس من رحمۃ اللہ تعالیٰ لا یحصل الا اذا اعتقد الانسان ۱۔	اللہ کی رحمت سے نا امیدی اسی وقت ہوگی جب انسان اعتقاد کرے کہ ا۔
ان الالٰہ غیر قادر علی الکمال	اللہ اس کام کے پورے کرنے پر قادر نہیں
او غیر عالم بجمیع المعلومات	یا تمام معلومات پر حاوی نہیں
او لیس بکریم بل ھو بخیل	یا اللہ کریم نہیں بخیل ہے (معاذ اللہ)
وکل واحد من ھذہ الثلاثۃ یوجب الکفر	ان تینوں باتوں میں سے ہر ایک بات موجب کفر ہے
فاذا کان الیاس لا یحصل الا عند حصول احد ھذہ الثلاثۃ وکل واحد منہا کفر ثبت أن الیاس لا یحصل الا لمن کان کافراً	جب نا امیدی انھیں تینوں باتوں میں سے کسی ایک کا ثمرہ ہے تو ظاہر ہے کہ نا امید وہی ہوگا جو کافر ہو اور خدا کی خدائی کا منکر ہو۔

فرمایا:۔ یعقوب علیہ السلام کی اس شان اور اس علوِ ایمان سے اللہ تعالیٰ مومنین کو تعلیم دیتا ہے کہ خواہ کیسا ہی ابتلا نازل ہو مگر مومن کی یہی شان ہے کہ کسی حال میں بھی اللہ سے غافل نہ ہو۔

دلم ز ساکن بیت الحزن عجب وارد ! کہ رو بحضرت حق در ہوائے فرزند است

عرض کی یا حضرت ایک کے لیئے تمام اولاد سے منہ موڑ لینا اور پھر حادثہ بن یامین کا پیش آنے اور یا اسف یوسف پر ہوں اِس کے کیا معنی ؟

رونے سے ہیں کام کسی کی خبر آئے

فرمایا:- الاسی یبعث الاسی متمم اپنے بھائی مالک بن نویرہ کے مرثیہ میں کہتا ہے:-

لقد لامنی عند القبور علی البکا رفیقی لتذراف الدموع السوافك

(قبروں کے پاس رونے سے میرے ساتھی نے مجھے ملامت کی کہ اس اشک خون ریزی سے کیا فائدہ)

فقال أتبکی کل قبر رأیته لقبر ثوی بین اللوی والدکادك

(اس نے کہا کہ کیا بات ہے کہ تو ایک خاص قبر کے لئے جو مقامات لوی و دکادک کے درمیان ہے جس قبر کو دیکھتا ہے رونے لگتا ہے) فقلت له ان الاسی یبعث الاسی فدعنی فھذا کلہ قبر مالك (میں نے جواب دیا کہ رنج سے رنج برانگیختہ ہوتا ہے، مجھے نہ چھیڑو، میرے نزدیک تو یہ سب قبریں مالک ہی کی ہیں)

حقیقت استرجاع | عرض کی:- کیا یہ مناسب نہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر شدید مصیبت نازل ہوئی تھی تو بجائے اظہار اسف وحزن کے انا للہ وانا الیہ راجعون کہتے کہ پروردگار کی جانب سے صلوات ورحمت کے مستحق ٹھہرتے اور مہتدی بنتے۔

فرمایا:- ایک روایت یہ بھی ہے کہ استرجاع (انا للہ وانا الیہ راجعون کہنا) خصیصۂ امت محمدیہ ہے لیکن یہ روایت قوی نہ ہوگی، اس لئے کہ اِنَّا لِلّٰہ سے مراد یہ ہے کہ انا مملوکون لِلّٰہِ وَھُوَ الَّذِی خَلَقَنَا وَاَوْجَدَنَا (ہم اللہ ہی کی ملکیت ہیں اسی نے ہمیں پیدا کیا اور وہی وجود میں لایا) اور انا الیہ راجعون (ہم اسی اللہ کی جانب لوٹنے والے ہیں) اس میں حشر اور قیامت کی جانب اشارہ ہے۔

کوئی خدا پرست قوم ممکن نہیں کہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کے مفہوم سے بے خبر ہو

میں تو سمجھتا ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ الصلاۃ والسلام کے ان اقوال میں :-

(۱) فصبرٌ جمیل ۔
(۲) عسَی اللہ ان یاتِینی بھم جمیعًا ۔
(۳) انہ ھو العلیم الحکیم ۔
(۴) انما اشکوا بثّی وحزنی الی اللہ ۔
(۵) واعلم من اللہ ما لا تعلمون ۔
(۶) لا تیأسوا مِن روح اللہ
(۷) لا ییأس من روح اللہ اِلّا القوم الکافِرون ۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ کا پورا مفہوم موجود ہے ۔

سفیدیٔ چشم یعقوبؑ رہی یہ بات کہ حضرت یعقوب علیہ السّلام کی آنکھیں فرطِ گریہ سے اندھی ہو گئی تھیں تو یہ بھی خلاف واقع ہے، کلام اللہ میں غلبۂ بکا سے آنکھوں کے سفید ہو جانے کا تذکرہ ہے، اندھے ہونے کا تذکرہ نہیں ہے ۔

وعند غلبۃ البکاء یکثر الماء فی العین فتصیر العین کانھا ابیضت من بیاض ذٰلک الماء

جب گریہ غالب ہوتا ہے تو آنکھ میں آنسو بھر جاتا ہے، اس حالت میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سفیدی آب دیدہ کے باعث گویا دیدے سفید ہو گئے ہیں ۔

وقولہ وابیضت عیناہ من الحزن کنایۃٌ عن غلبۃ البکاء

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ یعقوبؑ کی دونوں آنکھیں حُزن سے سفید ہو گئیں بطور کنایہ اسی غلبۂ بکا ہی مراد ہے ۔

وَالدَّلیلُ علی صحۃ ھذا القول ان تاثیر الحزن فی غلبۃ البکاء لا فی حصول العمی

اس بات کے درست ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حزن کی تاثیر گریہ غالب ہونے میں ہے، نابینا ہو جانے میں نہیں ہے

فالاحسن ان یحمل الابیضاض علی غلبۃ البکاء لاعلی العمی۔

اس لئے بہتر یہی ہے کہ آنکھوں کے سفید ہوجانے کو غلبۂ بکا پر محمول کیا جائے، نابینائی پر محمول نہ کیا جائے۔

ردّ بصر عرض کی:۔ فراق یوسف میں اگر یعقوب اندھے نہیں ہوئے تو قمیص یوسف کے لیجانے اور اس کے باعث دوبارہ بصیر ہوجانے کے کیا معنی؟

اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هَٰذَا فَأَلْقُوهُ عَلَىٰ وَجْهِ أَبِي يَأْتِ بَصِيرًا وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ۔

یوسفؑ نے بھائیوں سے کہا میرے اس قمیص کو لے جاکے میرے باپ کے منہ پر ڈال دو، ان میں بصارت آجائیگی اور تم لوگ اپنے تمام گھروالوں کو لے کے میرے پاس آجاؤ۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَن تُفَنِّدُونِ۔

جب قافلہ جدا ہوا یعنی مصر سے کنعان کو چلا تو یعقوبؑ نے اپنے گھروالوں سے کہا: مجھے تو حقیقت میں یوسفؑ کی ہوا آرہی ہے، اُن کی خوشبو پارہا ہوں اگر تم مجھے خرافت سے منسوب نہ کرو۔

فَلَمَّا أَن جَاءَ الْبَشِيرُ أَلْقَاهُ عَلَىٰ وَجْهِهِ فَارْتَدَّ بَصِيرًا

جب بشارت دینے والا آیا، یوسفؑ کے قمیص کو یعقوبؑ کے مُنہ پر ڈال دیا تو پھر سے بصارت آگئی۔

قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔

یعقوبؑ نے کہا: کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ اللہ کی نسبت جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

تحقیق ردّ بصر فرمایا:۔ آیات و روایات کے درمیان توفیق و تطبیق دی جاچکی ہے:۔

علم یوسف ان اباہ ما صار اعمی الا انہ من کثرۃ البکاء و ضیق القلب ضعف بصرہ فاذا القی علیہ قمیصہ

یوسفؑ کو علم تھا کہ یعقوبؑ اندھے نہیں ہوئے البتہ کثرت گریہ و تنگدلی سے بصارت میں ضعف آگیا ہے، میرا قمیص اگر اُن پر ڈال دیا گیا تو اُن کے

فلا بدان ينشرح صدره وان يحصل	سینہ میں انشراح پیدا ہوگا اور لامحالہ ان کے دل
فی قلبه الفرح الشديد و ذالك يقوی	کو نہایت فرحت ہوگی۔ جس سے روح میں طاقت
الروح ويزيل الضعف عن القوی	آئیگی اور قوتوں میں جو ضعف آگیا ہے وہ زائل ہوجائیگا
فحينئذ يقوی بصره ويزول عنه ذالك	نتیجہ یہ ہوگا کہ بصارت قوی ہوجائیگی اور یہ نقصان جو
النقصان	بینائی میں اس وقت آچلا ہے جاتا رہیگا۔
وقوله فارتد بصيرا " ای لما	اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ یعقوب کو پھر سے سوجھنے اور
القوا القميص علی وجهه وبشر	دکھائی دینے لگا اس کے یہ معنی ہیں کہ یعقوب علیہ السلام
بحياة يوسف عليه السلام عظم	کے منہ پر جب قمیص کو ڈالا اور یوسف علیہ السلام کی
فرحه وانشرح صدره وزالت	زندگی کی انہیں خبر ہوئی تو بہت ہی خوش ہوئے،
احزانه فعند ذالك	سینہ جو منقبض ہو رہا تھا کھل گیا، رنج و غم جاتے رہے،
قوی بصره وزال النقصان	جب یہ کیفیت ہوئی تو بصارت میں بھی قوت آگئی اور
عنه۔	قلت بصارت کی شکایت جاتی رہی۔

جب گلے سے مل گئے سارا گلا جاتا رہا

عبادت تا بہ یقین | فرماتے تھے کائنات کی ہر شئے مظنون ہے یقین صرف موت کا نام ہے، حیف ہے کہ انسان ظن کے درپے رہے اور یقین سے غافل ہوجائے۔

مستفیدین نے سند پوچھی تو فرمایا:۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۔	۔ اپنے پروردگار کی اس وقت تک عبادت کرتے رہو جب تک کہ یقین نہ آجائے۔

غرض کی ایک جماعت صوفیہ تو اسی سے استدلال کرتی ہے کہ شان ربوبیت کے

کے متعلق انسان جب درجۂ یقین تک پہونچ جائے تو عبادات کی تکلیف ساقط ہو جاتی ہے۔

فرمایا:۔

(۱) یقین جو ظن کے بالمقابل ہے اُس کے لئے "اِتیان" نہیں لاتے۔

(۲) کلام عرب میں موت کو یقین بھی کہتے ہیں۔

(۳) حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ نے یہاں یقین کی تفسیر موت سے کی ہے۔

(۴) القرآن یُفسّر بعضہ بعضاً۔ دیکھو کفار جہنم میں مبتلائے عذاب ہیں پوچھا جاتا ہے "مَاسَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ" تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی؟ عرض کرتے ہیں:۔ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ، ہم نماز گزاروں میں سے نہ تھے، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ، محتاج کو کھلاتے نہ تھے، وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ۔ اور خوض کرنے والوں کے ساتھ ہم بھی اسی دھن میں لگے رہتے تھے، حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں موت آگئی، دیکھو یقین کے معنی بجز موت کے یہاں کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے۔

رسائل و مسائل

تعلیمات قرآن کے متعلق بحث

از

جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز بی۔اے ہوم ڈیپارٹمنٹ دہلی

[ابتداءً جب تعلیمات قرآن پر نقد کیا گیا تھا، اس وقت بحث کو زیادہ طول دینے کا خیال نہ تھا۔اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا۔ پھر مولانا اسلم جیراج پوری کے جواب پر نظر کرتے ہوئے ذرا تفصیل سے کام لینا پڑا۔ مگر اب جناب پرویز نے ایک مفصل مضمون لکھ کر دعوت دی ہے کہ ان تمام مسائل پر وضاحت کے ساتھ بحث کی جائے جو تعلیمات قرآن پر تنقید کے سلسلہ میں چھڑ گئے تھے۔ چوہدری صاحب کا مضمون کافی طویل ہے۔اور جواب اس سے بھی زیادہ طویل ہوتا نظر آتا ہے۔ لہذا ان کے مضمون کو باقساط شائع کیا جائے گا اور ہر قسط کا جواب بھی ساتھ ساتھ درج ہوگا۔ اگرچہ یہ بحث طویل ہے لیکن اُمید ہے کہ ناظرین اس کو دلچسپ اور مفید پائینگے۔ ایڈیٹر]

بحث و نظر میں مقصود اگر تحقیق حق ہو اور روش میں رہے متانت و سنجیدگی تو ایسے اختلافات فی الواقع رحمت کے موجب ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مضمون (مطبوعہ ترجمان القرآن بابتہ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ) میں تعلیمات قرآن کا اجمالی سا تعارف کرایا تھا کہ میرے پیش نظر محض اس اسلوب کو نمایاں کرنا تھا جس کے مطابق ہمیں قرآن کریم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ آپ (مدیر ترجمان) نے اس پر استیعاباً تبصرہ فرمایا۔ چنانچہ آپ کی تنقید۔ صاحب تعلیمات کے جواب اور پھر آپ کی تنقید پر جواب ہے

بہت سے ایسے مباحث سامنے آگئے جن سے قلوب سلیم نے کافی استفاضہ کیا اور ایسے ہی ہیں وہ اختلافات جنہیں رحمت کہا جاتا ہے۔ ورنہ ہندوستان کی عام علمی فضار میں بالعموم اور مذہبی حلقوں میں بالخصوص اختلاف و مخالفت میں کوئی فرق ہی نہیں کیا جاتا اور بحث کا طریقہ بالکل ایسا ہوجاتا ہے گویا بچے کنکوؤں پر لڑ رہے ہیں۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ترجمان نے اس باب میں نہایت سنجیدہ روش کا ثبوت دیا ہے۔

میں نے اس بحث کو دلچسپی سے پڑھا ہے۔ معلوم نہیں کہ صاحب تعلیمات اب آپ کی تنقید پر جواب کے بعد پھر کچھ تحریر فرمائینگے یا نہیں۔ ان کے سابق طرز عمل سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ بحث و مجادلہ میں طوالت کو پسند نہیں فرماتے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر یہ بحث یوں ہی چھوڑ دی گئی تو اس کے متعدد گوشے تشنۂ تکمیل رہ جائیں گے۔ لہذا میں نے جسارت کی ہے کہ ایسے مقامات جن سے کم از کم میں ابھی تک مطمئن نہیں ہوسکا۔ ترجمان کے صفحات پر پھیلادوں تاکہ مزید تفحص و تدبر میرے اور میرے جیسے دیگر قلوب کے لئے اطمینان و ایقان کا موجب ہوسکے۔ ان فی ذالک لآیٰت لاولی الابصار۔

جن و انس جنوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ صراحت موجود ہے کہ وہ آتشیں مخلوق ہیں۔ انسانوں سے بالکل الگ' اس میں کسی شبہ یا اختلاف کے گنجائش نہیں۔ البتہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے معماروں، غوطہ خوروں اور غوطہ خوروں کے متعلق تعلیمات قرآن میں یہ حاشیہ دیا گیا ہے کہ "خیال ہوسکتا ہے کہ وہ انسانوں کا ایک طبقہ ہے۔" اس کے خلاف ترجمان نے دو وجہیں بیان کی ہیں۔

(۱) غیر مادی مخلوق کو اللہ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متشکل ہوں اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت ابراہیمؑ و حضرت لوطؑ اور حضرت مریمؑ کے سامنے انسانی شکل میں متمثل ہوئے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اُس سے آپ نے جو نتیجہ مستنبط فرمایا ہے کہ جن بھی بشری شکل میں متمثل ہوسکتے ہیں۔ یہ کیسے ثابت ہوگیا۔ اول تو حیرت ہے کہ جنوں کو آپ نے غیر مادی کیسے قرار دے دیا حالانکہ اُن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ اور آگ مادہ ہے۔ اور عناصر اربعہ مادیہ میں سے ایک عنصر۔ دوسرے یہ کہ قرآن کریم نے اُن کو غیر مرئی بتایا ہے۔

اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۷ : ۳)	حقیقت یہ ہے کہ وہ (ابلیس) اور اُس کا قبیلہ تم کو وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے تم اُس کو نہیں دیکھتے

اس لئے قرآن پاک کی اس شہادت کے خلاف، محض فرشتوں کے پیکر بدلنے پر جنوں کو مرئی خیال کرنا جس کی کوئی مثال مثل تبدیل پیکر فرشتگان، قرآن نے نہیں دی، درست نہیں ہوگا۔ لہٰذا جب تک جنوں کا مرئی ہونا ثابت نہ ہوجائے، جنود سلیمانی کی مرئی و محسوس ہستیوں کو آتشیں جن ماننے کا قیاس مرجح نہیں ہوسکتا۔

(۲) دوسری وجہ یہ لکھی گئی ہے کہ ملکۂ سبا کے تخت حاضر کردینے کا جس نے دعوےٰ کیا تھا وہ آتشیں جن تھا۔ کیوں کہ انسان اس پر قادر نہیں کہ ایک گھڑی بھر کے عرصہ میں اتنے فاصلہ سے تخت لا سکے۔

لیکن انسان کے عدم قدرت کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے دراں حالیکہ قرآن کریم کے تمام شارحین اس شخص کو جس نے ملکۂ سبا کا تخت ایک لمحے میں منگا دیا تھا، جن نہیں قرار دیتے، انسان ہی قرار دیتے ہیں۔

وَقَالَ الَّذِیْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ (۲۷ : ۳)	اور اس شخص نے جس کے پاس کتاب کا علم تھا کہا کہ میں اس تخت کو آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لادوں گا

اگر طرفۃ العین میں تخت لا دینے والا انسان ہو سکتا ہے تو گھڑی بھر میں لانے والا انسان کیوں نہیں ہو سکتا۔

ان توجیہات کی روشنی میں کیا آپ اس پر مزید غور فرمائینگے؟ اتنا اور بھی گذارش کردوں کہ اگرچہ صاحب تعلیمات نے اپنے جواب میں شیطان اور ابلیس کے فرق کو واضح کر کے یہ بتایا تھا کہ ابلیس یقیناً جن ہے لیکن چونکہ ہر شیطان ابلیس نہیں، اس لئے ہر شیطان جن بھی نہیں۔ شیاطین کا لفظ قرآن کریم میں انسانوں کے لئے بھی مستعمل ہوا ہے۔ لیکن آپ اپنی تنقید مزید میں والشیاطین کل بناء وغواص، کے ترجمہ میں شیاطین (یا جن) لکھ کر مفہوم پھر جنوں کے متعلق لے گئے ہیں۔ اگر ان شیاطین کو ہم انسان ہی مان لیں تو ان کے مرئی ہونے کی وجہ سے کیا یہ خیال قرآن کریم سے زیادہ قریب نہیں ہوگا؟ (باقی)

الجواب

حقیقت جن

"جن" کی حقیقت کے متعلق شبہات کی ابتدا دور جدید میں غالباً انیسویں صدی کے وسط آخر میں ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں محض کسی مذہبی کتاب کی سند پر کسی ایسی شئے کو موجود ماننا جس کے وجود کا کوئی سائنٹفک ثبوت موجود نہ ہو بڑے شرم کی بات ہو گئی تھی، اور ایسی شرمناک بات کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا تھا جو اس زمانہ کے اہل علم کی نگاہوں میں تاریک خیال اور توہم پرست کٹھ ملا بننے کے لئے تیار ہوتا۔ ان حالات میں اُن مسلمانوں نے جو اپنی دنیوی ترقی کے لئے اپنے غیر مسلم آقاؤں اور پیشواؤں کی نگاہوں میں روشن خیال اور عقل پرست بننا ضروری سمجھتے تھے ایک نئی نگاہ سے قرآن مجید کا مطالعہ شروع کیا، اور ہر اس مسئلہ کو جسے ماننے کے لئے

انیسویں صدی کے مادّہ پرست بندگان حواس و پرستاران عادت آمادہ نہ ہو سکتے تھے ایسے عجیب طریقوں سے تاویل کے خراد پر چڑھایا کہ وہ مسئلہ قرآن سے خارج بھی نہ ہوا اور اُن لوگوں کے افکار و تخیلات کے مطابق ڈھل بھی گیا جو قرآن کی روح اور اس کے اصولِ اولیّہ سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں جن قرآنی ارشادات کو توڑا مروڑا گیا انہی میں سے ایک وہ ارشادات ہیں جو ابلیس، شیاطین، اور جنوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کہا گیا کہ ان الفاظ سے کوئی ایسی مخلوق مراد نہیں ہے جو انسان سے الگ کوئی فوق الطبیعی وجود رکھتی ہو، بلکہ اُن سے کہیں تو انسان کی اپنی بہیمی قوتیں مراد ہیں جنہیں شیاطین کہا گیا ہے، اور کہیں ان سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں، اور کہیں اُن سے وہ لوگ مراد ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ اُن کا ارتکاب صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو یا تو عربی زبان اور قرآن مجید کا تھوڑا سا علم بھی نہ رکھتا ہو، یا پھر اس کے دل میں خدا اور یوم آخر کے خوف سے زیادہ دنیا اور اہل دنیا کا خوف ہو۔ لیکن ۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جن حالات سے ہندوستان کے مسلمان گزرے ہیں ان میں یہ دونوں باتیں جمع ہو گئی تھیں، اس لئے ایسی اور اس سے بھی زیادہ رکیک تاویلات قرآن مجید میں کی گئیں اور طرفہ ماجرا یہ ہے کہ ادّعائے علم و حمایت اسلام کے ساتھ کی گئیں!

جس طرح انسان پر بہت سے دور گذر چکے ہیں اسی طرح یہ دور بھی گزر گیا۔ اب خود یورپ میں بھی ایک بڑا گروہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو روحانیت کا قائل ہے، اور اس محسوس و مرئی دنیا کے علاوہ ایک ایسے عالم کے وجود کو بھی مانتا ہے جو ہمارے حواس سے پوشیدہ ہے۔ اس لیے اب جن اور شیاطین کے مستقل وجود کو تسلیم کرنا اتنا خطرناک نہیں رہا ہے جتنا اب سے بیس پچیس برس پہلے تھا۔ تاہم ابھی اس دور کے اثرات بالکل زائل نہیں ہوئے ہیں، اور ابھی تک محض قرآن کی سند پر کسی ایسی بات کو ماننے سے دماغ انکار کر رہے ہیں جو فوق الطبیعی ہونے کے ساتھ خارقِ عادات

بھی ہو۔ یہ اسی دور کے نیچے کھچے اثرات تھے جو "تعلیمات قرآن" میں ہم کو نظر آئے۔ مولانا اسلم جیراج پوری قرآن کے صریح ارشادات کو دیکھ کر یہ تو ماننے پر مجبور ہو گئے کہ "جن" سے مراد ایک آتشیں مخلوق ہے جو انسان سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ لیکن قرآن میں جگہ جگہ جنوں کی طرف جو امور منسوب کیے گئے ہیں، وہ چونکہ خارق عادت ہیں، اور ان کو بعینہ اس طرح ماننا جس طرح قرآن میں وہ بیان ہوئے ہیں، اقتضائے عقلیت کے خلاف محسوس ہوتا ہے، اس لیے انہوں نے کسی نہ کسی طرح تاویل کر کے جنوں کی دو قسمیں قرار دے لیں۔ ایک وہ مخصوص نوع کی مخلوق جو ناری الوجود ہے اور انسان سے اصلاً مختلف ہے۔ دوسرے انسانوں کا کوئی خاص طبقہ جس کے متعلق نہ وہ خود جانتے ہیں نہ کسی حوالہ سے بتا سکتے ہیں کہ وہ کون سا طبقہ ہے اور کس بنا پر "جن" کے نام سے موسوم ہو گیا؟

ہمارے دوست چوہدری غلام احمد صاحب پرویز، الحمد للہ ان اثرات سے محفوظ ہیں مگر پھر بھی ایک مقام پر ان کو "جن" کے انسان ہونے کا شبہ ہو ہی گیا۔ وہ مولانا اسلم جیراج پوری کے اس خیال سے تو متفق نہیں ہیں کہ "قرآن مجید میں جہاں جہاں جن اور انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن سے مراد آتشیں جن نہیں بلکہ انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے"، لیکن خاص کر حضرت سلیمان کے جنوں پر ان کو بھی شبہ ہے کہ وہ انسان ہی تھے آتشیں نہ تھے، کیوں کہ نظر آتے تھے اور انسانوں کی طرح غوطے لگاتے اور برتن بناتے تھے۔

ایک قاعدہ اس مسئلہ کی تحقیق میں آگے قدم بڑھانے سے پہلے ایک قاعدہ ذہن نشین کر لیجیے، اللہ تعالیٰ جب اپنی معلومات میں سے کسی ایسی شئے کو جو ہمارے دائرۂ علم و ادراک سے خارج ہے ہمارے علم میں لانا چاہتا ہے، تو لامحالہ وہ اس شئے کو ہماری زبان کے کسی ایسے ہی لفظ سے تعبیر کرتا ہے جس کو ہم نے اس معلوم الٰہی کے ساتھ قریب تر مناسبت رکھنے والی کسی چیز کے لئے وضع

کیا تھا تاکہ ہم اُس شئے کا کسی حد تک صحیح تصور کرسکیں جو اللہ کے علم میں ہے اور ہمارے علم میں نہیں ہے یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ حق تعالیٰ کسی چیز کو یونہی کسی مناسبت اور ربط معنوی کے بغیر کسی خاص لفظ سے موسوم کردے درانحالیکہ اس چیز کے لیے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر اُس خاص لفظ کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو جس چیز کو "جنت" سے تعبیر کیا گیا ہے اس کے لیے لفظ "جنت" بمقابلہ "جہنم" کے اولیٰ نہ ہوتا' اور جس چیز کو "نور" سے تعبیر کیا گیا ہے اُس کے لیے "نار" کا استعمال بھی اسی طرح جائز ہوتا۔

"جن" کی لغوی تحقیق

اس قاعدہ کے مطابق ہم کو سب سے پہلے لفظ "جن" کی تحقیق کرنی چاہیے کہ کلام عرب میں اس کو کس معنی کے لیے وضع کیا گیا تھا' اور حق تعالیٰ نے جو اس کو اپنی ایک خاص مخلوق کے لیے دوسرے الفاظ کے مقابلہ میں ترجیح دی تو کس مناسبت کی بنا پر دی۔

"جن" کا مادہ ج ن ن ہے۔ اس مادہ کا مرکزی تصور "پوشیدگی" ہے' اور اس کے تمام مشتقات میں کسی نہ کسی طور پر یہ تصور ضرور پایا جاتا ہے اصل الجن ستر الشئ من الحاسہ۔ (راغب) کل شیٔ ستر عنک فقد جن عنک (جمہرہ ابن درید و لسان العرب)۔

اسی بنا پر جنان ہر چیز کے جوف کو کہتے ہیں جو نظر نہیں آتا روح کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ جسم اسکو چھپائے ہوئے ہے۔ دل کو جنان اسلیے کہتے ہیں کہ وہ صندوق سینہ میں مستور ہے۔ حریم خانہ کو جنان اس لیے کہتے ہیں کہ وہ چہار دیواری سے چھپا ہوا ہے۔ باغ کو جنت اس لیے کہتے ہیں کہ درختوں کے جھنڈ اس کی زمین کو چھپا لیتے ہیں۔ اگر باغ میں یہ صفت نہ ہو تو اس کو جنت نہیں کہہ سکتے۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہے جنین ہے۔ رحم کو بھی جنین کہتے ہیں۔ میت جب دفن کردی جائے تو وہ بھی جنین ہے۔ حتیٰ کہ ہر چیز جو چھپی ہوئی ہے اس پر جنین کا اطلاق ہوگا۔ چنانچہ چھپے ہوئے کینے کو حقد جنین کہا گیا ہے۔ قبر کو جنن کہتے ہیں۔ کفن کے لیے بھی یہ لفظ آیا ہے۔ دفن کرنے کے لیے اِجنان کا لفظ آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے

فلی دفنہ صلے اللہ علیہ وسلم واجنانہ علی والعباس ۔ پردے اور آڑ کو جُنۃ کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے اتخذوا ایمانھم جُنۃً "انہوں نے اپنی قسموں کو اس نفاق کے لیے پردہ بنالیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں لیے ہوئے ہیں"۔ جنہ و جن علیہ ، چھپالیا اس کو۔ چنانچہ قرآن میں ہے فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ جب رات کی تاریکی اس پر چھاگئی۔

اِجنان کے معنی چھپا دینا اور استجنان کے معنی چھپ جانا۔ جنّ اللیل وجنان اللیل وجنون اللیل رات کی شدید تاریکی جو پردہ پوش ہوتی ہے۔ چنانچہ دُرید بن الصمۃ کہتا ہے

ولولا جنون اللیل ادرک رکضنا

اور ہذلی کہتا ہے۔

حتیٰ یجیئ وجن اللیل یوغلہ

راز اور پوشیدگی کو بھی جن کہتے ہیں مثل ہے لاجن بھذا الامر یعنی اس معاملہ میں کوئی راز نہیں ہے۔ جنُّ الناس اور جنانُ الناس آدمیوں کی اُس بھیڑ کو کہتے ہیں جس میں اگر کوئی آدمی گھر جائے تو پتہ نہ چل سکے کہ کہاں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کے نام سے جس نوع مخلوقات کو موسوم کیا جائیگا وہ لازمی طور پر غیر محسوس یا کم از کم مستور ہونی چاہیے۔ جس مخلوق میں مستوری کی صفت نہ پائی جائے اُس کو اس نام سے کبھی موسوم نہ کیا جائیگا۔ تمام اکابر اہل لغت نے بالاتفاق یہی بات جنوں کی وجہ تسمیہ میں لکھی ہے۔ چنانچہ جمہرۂ ابن درید مفردات امام راغب صحاح قاموس لسان العرب تاج العروس غرض عربی زبان کی کسی مستند لغت کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ سب میں یہی لکھا ملیگا کہ "جن" اس نام سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں۔

کلام عرب کی شہادت لغت کے بعد کلام عرب پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قرآن مجید نے

بطور خود یہ کوئی نئی اصطلاح وضع نہیں کی تھی۔ بلکہ اہل عرب پہلے سے ایک ایسی فوق الطبیعی مخلوق کو جن کے نام سے یاد کرتے تھے جو بالاصل غیر مرئی و غیر محسوس تھی، مگر کبھی کبھی ان کو مختلف شکلوں میں نظر آتی تھی، اور جس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ غیر معمولی افعال پر قادر ہے، اور عالم طبیعت و اجسام پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ خاص خاص مقامات پر یہ مخلوق قابض ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسے مقامات کو وہ ارض مجنۃ کہا کرتے تھے خالی مکانوں کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ ان میں جنوں کا تسلط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جو شخص کسی خالی مکان میں رات گذارتا تو اس کو کہتے کہ وہ رات جنوں کا مہمان تھا۔ اخطل کہتا ہے :۔

وبتنا کانا ضیف جن بلیلۃ

جہلائے عرب جب کوئی نیا مکان بنواتے تو پہلے وہاں جنوں کے لئے قربانی کرتے تاکہ وہ ساکنین مکان کو نہ ستائیں۔ اسی کی طرف حدیث میں اشارہ ہے کہ انہ نہی عن ذبائح الجن "یعنی آپ نے جنّوں کے لیے قربانی کرنے کی ممانعت کر دی"۔ جب کوئی انسان پاگل ہو جاتا تو یہ لوگ سمجھتے کہ اس پر جن مسلط ہو گیا ہے۔ اسی لیے اس کو مجنون کہتے تھے۔ قرآن مجید میں بھی ان کے اس خیال کو بیان کیا گیا ہے کہ افتریٰ علی اللہ کذباً ام بہ جنۃ (۳۴: ۸) جب گائے پانی نہ پیتی تو اس کے نر کو مارا جاتا تھا۔ کیونکہ اعتقاد یہ تھا کہ جن اس کے سر پر سوار ہو جاتا ہے اور وہ مادہ کو پانی پینے سے روکتا ہے۔ ان کا وہم تھا کہ ایک جن ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کو وہ "تابع" یعنی ہمزاد کہا کرتے تھے۔ ہر غیر معمولی چیز جنوں کی طرف منسوب کی جاتی تھی۔ چنانچہ جو شخص کام میں بہت تیز ہوتا اس کے متعلق وہ سمجھتے کہ جن اس میں سما جاتا ہے۔ اس لئے اس کو جنی (یعنی منسوب بہ جن نہ کہ خود "جن") کہا جاتا تھا۔ ہر شاعر کا ایک خاص "جن" ہوتا تھا اور وہی اس کو شعر کہوایا کرتا تھا۔ جب کسی شخص کا زور ٹوٹ جاتا تو کہتے کہ نفثت جنۃ

یعنی اس کا جن جس کے زور سے وہ کام کر رہا تھا، بھاگ گیا۔ جو عورت بہت جمیل ہوتی اس کو مجازاً جنّیہ یعنی "پری" کہتے کیونکہ جنّیات کا جمال ان کے نزدیک فوق الانسانی جمال تھا۔ وہ جنوں کی انہی فوق الانسانی صفات اور قدرتوں کی بنا پر خدا سے ان کا نسب ملاتے تھے چنانچہ قرآن میں ہے وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسباً (۳۷: ۲) ان کو عبادت میں شریک کرتے بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (۳۴: ۵) وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ الجن وخلقهم وخرقوا له بنین وبنٰت بغیر علم (۶: ۱۱) مصیبت اور خوف کے وقت اُن سے پناہ مانگتے تھے کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن (۷۲: ۱)۔ وہ ملائکہ کو بھی "جن" کہتے تھے۔ چنانچہ اعشیٰ کا قول ہے:۔

وسخر من جن الملائك تسعة — قیاما لدیه یعملون بلا اجر

ان کے متعلق جہلائے عرب کا خیال تھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ اسکی طرف متعدد مقامات پر قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (۴۳: ۲) اور اَفَاَصْفٰكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا (۱۷: ۴) ان قوی و کثیر شہادتوں کے مقابلہ میں ایک شہادت بھی کلام عرب سے ایسی نہیں دکھائی جا سکتی جس میں "جن" کا اطلاق حقیقی معنوں میں انسان پر کیا گیا ہو۔ بلکہ اس کے برعکس کلام عرب سے صریح طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ عرب "جن" اور "انس" کو دو مختلف نوع کی مخلوقیں سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر بدر بن عامر کہتا ہے:۔

ولقد نطقت قوافیا انسیة — ولقد نطقت قوافی التجنین

اور عمران بن حطان الحروری کہتا ہے:۔

قد کنت عندك حولا لا تروعنی — فیه روائع من انس ولا جانی

اس کے بعد ائمہ لغت کی متفقہ شہادت ملاحظہ ہو۔ جوہری اپنی کتاب الصحاح میں کہتا ہے:۔
الجن خلاف الانس سُمیت بذلك لانها تخفی ولا تُری۔
ابن سیدہ کہتا ہے:۔ الجن نوع من العالم سُموا بذلك لاجتنانهم عن الابصار ولانهم استجنوا من الناس فلا یرون

ابن درید کہتا ہے:۔ "والجن خلاف الانس"۔

چند مقدمات یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے چند باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں:۔

ایک یہ کہ لغت عرب میں لفظ جن کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں "چھپے ہوئے" اور "پوشیدہ" کے ہیں۔ اس لفظ کو جب انواع مخلوقات میں سے کسی نوع کے لیے بطور اسم استعمال کیا جائیگا تو ضرور ہے کہ وہ کوئی ایسی نوع ہو جو عادتاً مخفی و مستور ہو حتیٰ کہ اس کا ظاہر اور نمایاں ہونا خرق عادت میں سے شمار کیا جائے نہ یہ کہ وہ عادتاً ظاہر اور نمایاں ہو جیسے انسان۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ لفظ سیّال کا اطلاق ہمیشہ ایسی ہی چیز پر کیا جائیگا جو عادتاً بہنے والی ہو، اور اگر کبھی وہ جامد پائی جائے تو اس کا جمود خلاف معمول شمار کیا جائے (مثلاً پانی) لیکن اگر کوئی شخص لفظ سیال کا اطلاق کسی ایسی چیز پر کرے جو عادتاً جامد ہو (مثلاً پتھر) اور جس کا جامد ہونا نہیں بلکہ سیّال ہونا خلاف معمول ہو تو آپ یقیناً حکم لگادیں گے کہ وہ شخص لفظ سیّال کے معنی سے ناواقف ہے، اور لفظ کو اس کے غیر معنی موضوع لہ میں استعمال کر رہا ہے۔ اسی طرح اگر قرآن مجید میں لفظ "جن" (مخفی و مستور) کا اطلاق کسی ایسی مخلوق پر کیا جاتا جو عادتاً مخفی و مستور نہیں ہے، بلکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے مرئی اور محسوس ہے (مثلاً انسان) تو نعوذ باللہ یہ اس بات کی دلیل ہوتی کہ اس کتاب کو پیش کرنے والا یا تو مجنون ہے یا لفظ "جن" کے معنی سے ناواقف ہے۔ یقین مانیے کہ ایسی صورت میں خواہ تمام عجم قرآن پر ایمان لے آتا، مگر کوئی عرب تو کبھی اس پر ایمان نہ لاتا، کیوں کہ وہ "جن" کا بطور معجزہ وخرق عادت مرئی و محسوس بن جانا تو مان سکتا ہے، مگر یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ مرئی و محسوس انسان کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا جائے۔ جس وقت کفار عرب نے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی عجمی شخص قرآن سکھاتا ہے، تو اپنے اس دعویٰ کی تائید میں وہ کوئی دلیل پیش نہ کر سکے، اور جب قرآن نے ان کے اس الزام کا یہ جواب دیا کہ لِسَانُ الَّذِی یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ

اعجمی وھذا لسان عربی مبین (۱۶ : ۱۴)

جس شخص کو یہ سکھانے والا بتاتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے حالانکہ قرآن جس زبان میں ہے وہ عربی مبین ہے"۔ تو اس جواب کو سن کر تمام عرب کی زبانیں بند ہو گئی تھیں لیکن اگر کہیں اس وقت کفار عرب کو قرآن میں ایک مثال بھی ایسی مل گئی ہوتی جس میں لفظ "جن" کا اطلاق انسان پر کیا گیا ہوتا تو وہ پلٹ کر جواب دیتے کہ یہ کہاں کی لسان عربی مبین ہے جس میں "جن" کا اطلاق انسان پر کیا جا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ عرب میں پہلے سے "جن" کا نام ایک ایسی فوق الطبعی غیر جسمانی مخلوق کے لیے موضوع اور شائع و متعارف تھا جو عادتاً محسوس نہ ہوتی تھی جس کو کبھی کبھی وہ "سعالی" اور "غول" وغیرہ کی شکل میں دیکھتے تھے، اور جس کے متعلق ان کا اعتقاد تھا کہ وہ فوق الطبعی انداز سے ان پر اثر انداز ہوتی ہے پس جب قرآن نے اس شائع شدہ لفظ کو استعمال کیا تو لامحالہ اس کے معنی وہی لیے جائینگے جن کے لیے وہ پہلے سے وضع کیا ہوا تھا اور شائع تھا۔ قرآن کا دعویٰ یہ تھا کہ "وہ عربی میں اتارا گیا ہے تاکہ عرب جو اس کے اولین مخاطب ہیں اس کو سمجھ سکیں" اِنَّا انزلنٰه قرآناً عربیاً لعلکم تعقلون (۱۲:۱) یہ دعویٰ اسی صورت میں سچا ہو سکتا تھا کہ قرآن میں وہی الفاظ اور اصطلاحات اور انداز بیان استعمال کیے جاتے جو عرب میں رائج اور معروف تھے اور اگر اہل عرب کی زبان کے کسی لفظ کو معلوم و متعارف معنی کے سوا کسی خاص معنی میں استعمال کیا جاتا تو وہ اصل لغت کے خلاف نہ ہوتا اور اس خاص معنی کی تشریح کر دی جاتی، کہ عرب اس کو سمجھ سکتے۔ لیکن آپ لفظ "جن" کے جو معنی بیان کرتے ہیں وہ نہ تو اصلِ لغت کے مطابق ہیں، نہ کلام عرب میں معلوم و متعارف ہیں اور نہ اُن کی کوئی ایسی تشریح قرآن میں ملتی ہے جس سے واضح طور پر معلوم ہو جائے کہ اس نام کا وہ مسمّٰی مراد نہیں ہے جو اہل عرب نزولِ قرآن کے وقت اس سے مراد لیتے تھے۔ کیا یہ بات قرآن کے اس دعوی کی تکذیب کو متضمن نہیں ہے

تیسرے قرآن میں جگہ جگہ عربوں کے اس اعتقاد باطل کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ جن اور ملائکہ کو خدائی میں شریک کرتے، خدا سے ان کا نسب جوڑتے، ان سے پناہ مانگتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ پھر اس اعتقاد کا ابطال اس طرح کیا گیا ہے، کہ "جن" خدا کے شریک نہیں ہیں، نہ اس کی اولاد ہیں، بلکہ وہ بھی اسی طرح کی ایک مخلوق ہیں جس طرح انسان اس کی مخلوق ہے۔ فرق یہ ہے کہ انسان مٹی کے ست سے پیدا کیا گیا ہے، اور "جن" آگ کی پھونک سے۔ مگر احکام خداوندی کے مخاطب دونوں ہیں خدا کے سامنے جواب دہ ہونے میں دونو برابر کے شریک ہیں، اور نافرمانی کی سزا دونوں کے لیے یکساں ہے۔ پس انسان کا ان کی عبادت کرنا محض ایک جاہلانہ فعل ہے۔ بلکہ اس میں انسان کے لیے ذلت بھی ہے، اس لیے کہ انسان ایک بالاتر نوع ہے۔ جنوں کے نمائندے ابلیس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا، اور انکار کرنے پر راندۂ درگاہ کیا گیا، انسان کو رسالت کے بلند منصب پر سرفراز کیا گیا اور جنوں کو اس کے ذریعہ سے ہدایت دی گئی وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ ۔ الایۃ (۴۶: ۴) قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ الخ (۷۲: ۱) انسانوں ہی میں سے ایک برگزیدہ ہستی (سلیمان علیہ السلام) کو یہ شرف عطا ہوا کہ جن اس کے تابع کیے گئے۔ یہ تمام باتیں عربوں کے اُن اعتقادات باطلہ کی تردید اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جبکہ ان میں "جن" سے مراد وہی مخلوق ہو جس کو وہ خدائی میں شریک اور عبادت میں خدا کا ساجھی بناتے تھے لیکن اگر ان میں جن سے مراد انسان ہوں تو پھر یہ کسی طرح بھی ان اوہام کا ابطال کرنے والی نہ ہونگی، اور عربوں کے وہ اعتقادات اپنی جگہ پر رہیں گے جو وہ اپنے متصور جنوں کے متعلق رکھتے تھے۔

چوتھے اگر "جنوں" کے ذکر سے کسی خاص مقام یا بعض مخصوص مقامات پر قرآن کا مقصود دراصل انسانوں یا ان کے کسی خاص گروہ کا ذکر کرنا تھا، تو ان کو لفظ "جن" سے تعبیر کرنے کے لیے کونسی ضرورت داعی ہوئی تھی؟ کیوں نہ اُن کو لفظ انسان ہی سے تعبیر کیا گیا؟ خواہ مخواہ ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا حاجت پیش آئی تھی جن سے ناری جن اور خاکی جن کے درمیان التباس واقع ہوتا؟ یہ وہ

بات ہے جس کو ہمارے زمانے کے اکثر اہل تاویل قرآنی الفاظ کے معنی بیان کرتے وقت نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ اس پہلو پر کبھی غور نہیں کرتے کہ جب کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لیے معروف اور شائع الفاظ موجود ہیں اور خود قرآن نے بھی اس معنی کو بیان کرنے کے لیے حسب موقع وہی الفاظ استعمال کیے ہیں تو آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ کسی خاص مقام پر اُسی معنی کو بیان کرنے کے لیے (اگر واقع میں اس کا مقصود وہاں وہی معنی بیان کرنا ہو) بعض دوسرے الفاظ استعمال کرتا دراں حالیکہ وہ الفاظ اس معنی کے لیے شائع اور متعارف نہ تھے اور نہ ہیں۔ مثال کے طور پر اگر واقعہ یہی تھا کہ حضرت سلیمانؑ کو مصر سے یا دوسرے مقامات سے اعلیٰ درجہ کے غواص، ظروف ساز، معمار اور سنگ تراش آدمی فراہم کر کے دیے گئے تھے تو یہی کہہ دینے میں کونسا امر مانع تھا کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو ایسے اور ایسے آدمی فراہم کر دیے تھے۔ کیا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود نہ تھا کہ مجبوراً اس کو "جن" اور "شیاطین" کے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا خود اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کا ذکر کرنے کے مواقع پر ان کو انسان یا بنی آدم کے الفاظ سے تعبیر نہیں کیا ہے؟ اور اگر ان خاص آدمیوں میں کوئی خصوصیت ایسی تھی کہ اس کو "جن" اور "شیاطین" کے استعاروں میں ادا کرنا ضروری تھا تب بھی اس تصریح میں کیا چیز مانع تھی کہ یہ "جن" "بنی آدم" سے تھے؟

قرآن میں معنی جن کی تصریح

ان مقدمات کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب دیکھیے کہ قرآن مجید نے لفظ "جن" کو کس معنی میں استعمال کیا ہے۔ آپ تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں "جن" اور "انسان" کی حقیقتیں الگ الگ بیان کی گئی ہیں، اور بالفاظ صریح ایک جگہ نہیں، متعدد جگہ بتایا گیا ہے کہ "جن" ایک ناری الاصل مخلوق ہے اور "انسان" ارضی الاصل ہے۔ لفظ "جن" کو استعمال کرنے کے ساتھ جب اس کے معنی کی یہ تصریح بھی خود قرآن ہی نے کر دی ہے تو عقل یہ چاہتی ہے کہ جہاں کہیں وہ لفظ استعمال ہو، وہاں اس کے وہی معنی لیے جائیں جن کی تصریح

کی جا چکی ہے۔ اس کے خلاف کوئی اور معنی لینے کے لیے ضروری ہے کہ یا تو اس دوسرے معنی کی بھی کوئی ویسی ہی تصریح قرآن میں موجود ہو یا پھر آپ کے پاس ایسے قوی دلائل ہوں جن کی بنا پر قرآن کی تصریح کے خلاف معنی میں اس لفظ کو لینا جائز ہو۔ اگر پہلی صورت ہے تو براہ کرم کوئی ایک ہی آیت ایسی پیش فرمائیے جس میں "جن" بمعنی "انسان" کی [illegible] ہو جیسی کہ "جن" بمعنی "مخلوق آتشیں" کی تصریح ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ہم کو حق پہنچتا ہے کہ آپ ... کا جائزہ لیکر دیکھیں کہ آیا وہ اس حد تک قوی ہیں کہ قرآن نے "جن" کے جس معنی کی تصریح کی ہے اس کو چھوڑ کر آپ کے تجویز کردہ معنی کو قبول کیا جائے؟

جن بمعنی انسان کی پہلی دلیل

مولانا اسلم جیراج پوری نے جس بنا پر "جن" کے انسان ہونے کا گمان کیا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے:-

> "جن کا لفظ قرآن میں صرف مکی سورتوں میں آیا ہے۔ مدنی سورتوں میں کہیں نہیں آیا۔ اور انس کا لفظ بلا جن کے سارے قرآن میں کہیں مستعمل نہیں ہوا ہے۔ اس سے خیال ہو سکتا ہے کہ جن و انس کے الفاظ جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں وہاں جن کے معنی اس آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔"

میں پوچھتا ہوں کیا یہ کوئی دلیل ہے؟ کسی سورت کے مکی یا مدنی ہونے اور جن کے ساتھ انس کا لفظ آنے یا نہ آنے کو لفظ "جن" کے معنی میں آخر کس قسم کا دخل حاصل ہے؟ آپ ان تمام آیتوں کو

---

[1] بلاشبہ قرآن میں دو جگہ "جانّ" کا لفظ "سانپ" کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن اول تو خود قرآن ہی میں دوسری جگہ اس چیز کیلئے ثعبان اور حیۃ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہو گیا کہ وہاں جانّ کا لفظ کس معنی میں آیا ہے، دوسرے لفظ جانّ بمعنی سانپ عربی شاعری میں مستعمل ہے

نکال کر دیکھ لیجیے جن میں "جن" اور "انس" کے الفاظ ساتھ ساتھ آئے ہیں کسی جگہ بھی آپ کوئی اشارہ ایسا نہ پائینگے جو انس کے عام اور جن کے خاص ہونے پر دلالت کرتا ہو۔ جہاں کہیں جن اور انس کے الفاظ معطوف و معطوف علیہ کی حیثیت سے آئے ہیں وہاں حرف عطف نہ تو عطف العام علی الخاص یا عطف الخاص علی العام کے طور پر آیا ہے اور نہ عطف الشئی علی مرادفہ کے طور پر۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم کے عطف کا حکم لگانے کے لئے ضروری ہے کہ سامع کو پہلے سے اس کا علم ہو کہ معطوف و معطوف علیہ میں سے ایک عام ہے اور دوسرا خاص یا دونوں مرادف ہیں۔ مثلاً رَبِّ اغْفِرْلِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ میں سامع خود سمجھ سکتا ہے کہ عطف عطف العام علی الخاص کے قبیل سے ہے۔ یا وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّيْنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ۔ میں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ یا نالفی قولہ کذباً ومیناً میں عطف کا عطف الشئی علی مرادفہ کے قبیل سے ہونا ہر وہ شخص جانتا ہے جو "کذب" اور "مین" کے معنی سے واقف ہے۔ پس جب جن و انس میں یہ تینوں صورتیں نہیں ہیں تو لامحالہ یہ ماننا پڑیگا کہ ان دونوں کے درمیان واو عطف مطلق معیت کے لیے ہے۔ کیونکہ لغت سے یا عرف سے یا کسی قرینۂ عقلی سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص یا ترادف کا تعلق ہے۔ اگر قرآن کی اصطلاح خاص میں ان دونوں کے درمیان عموم و خصوص کا تعلق ہوتا اور پھر بغیر کسی تصریح کے وہ ان دونوں کے درمیان محض واو عطف استعمال کرتا تو یہ اس کے بیان کا نقص ہوتا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کم از کم الانس والجن منہم ہی کہنا چاہیے تھا کہ سامعین کو معلوم ہو جاتا کہ جن کے نام سے جس گروہ کو یاد کیا جا رہا ہے وہ لغت اور عرف عام کے خلاف انسانوں ہی کا ایک گروہ ہے۔

لیکن ہم کو عطف و معطوف کی بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ مدعی کا دعویٰ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں [illegible] آئے ہیں وہاں جن سے مراد انسانوں

ہی کا ایک طبقہ ہے۔ اب آپ ان تمام آیات کو پڑھ جائیے جن میں یہ دونوں لفظ یک جا استعمال ہوئے ہیں اگر خود انہی میں متعدد آیتیں آپ کو ایسی مل جائیں جن میں ان دونوں گروہوں کی مغایرت صاف نظر آتی ہو تو مدعی کا دعویٰ آپ باطل ہو جائیگا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (۱۵: ۳)

ہم نے انسان کو کالے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا اور اُس سے پہلے جنوں کو ہم نے لُو کی گرمی سے پیدا کیا تھا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵: ۱)

اس نے انسان کو ٹھیکری کی طرح کی بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لوسے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ (۵۵: ۲)

بس اس روز اس کے گناہ کی بابت نہ کسی انسان سے پوچھا جائیگا اور نہ کسی "جن" سے۔

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ (۵۵: ۳)

ان سے پہلے اُن حوروں کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہوگا اور نہ کسی جن نے۔

كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (۷۲: ۱)

انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ پکڑتے تھے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اَهٰٓؤُلَآءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ۔ بَلْ كَانُوْا

جس روز اللہ تعالیٰ اُن سب کو جمع کریگا، پھر ملائکہ سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہیں کو پوجا کرتے تھے؟ وہ عرض کرینگے تو پاک ہے ہمارا ولی تو ہے نہ کہ یہ۔ دراصل یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی پرستش کیا کرتے تھے اور

يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۔ (۳۴ : ۵)۔	ان میں سے اکثر درحقیقت انہی پر ایمان رکھتے تھے۔
وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (۳۷ : ۵)۔	اور انہوں نے خدا کے اور جنوں کے درمیان رشتہ جوڑ رکھا تھا۔
وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ وَقَالَ اَوْلِيٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۶ : ۵)۔	اور جس دن خدا ان سب کو جمع کریگا تو فرمائے گا اے گروہ جن تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا۔ اور انسانوں میں سے جو ان کے دوست ہیں وہ کہیں گے کہ پروردگار ہم میں سے بعض نے بعض سے خوب فائدہ اٹھایا اور اب ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کی تھی۔

ان آیات سے کیا ثابت ہو رہا ہے؟ یہ کہ جن اور انس دو الگ اور متباین الحقیقت گروہ ہیں؟ یا یہ کہ ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ کا ایک جز ہے؟

دوسری دلیل دوسری دلیل جس میں آپ اور مولانا اسلم جیراج پوری متفق ہیں، یہ ہے کہ ابلیس اور اس کی ذریت کو جو حسب تصریح قرآن "جن" ہیں، اللہ تعالیٰ نے غیر مرئی بیان کیا ہے۔ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (۴ : ۷) بخلاف اس کے حضرت سلیمان کے پاس جو جن تھے، وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت سلیمانؑ والے جن وہ آتشیں جن نہیں ہیں، بلکہ انسان ہیں۔

اس کے جواب میں بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ والے جنوں کے متعلق

قرآن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ نظر آتے تھے، انسانی شکل میں تھے، اور حضرت سلیمانؑ کے علاوہ عام لوگ بھی ان کو دیکھتے تھے لہٰذا قرآن کی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں وہ اُن آیات کے خلاف نہیں ہے جن میں حضرت سلیمان والے جنوں کا ذکر آیا ہے۔ رہا آپ کا یہ گمان کہ وہ انسانوں کے سے کام کرتے تھے، تو یہ بھی قرآن سے ثابت نہیں۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ وہ انسانوں کی طرح پانی میں غوطے لگاتے تھے، یا انسانوں کی طرح برتن اور عمارتیں بناتے تھے، یا انسانوں کی طرح باندھے جاتے تھے۔ وہاں تو مطلقاً غواصی اور ظروف سازی اور معماری وغیرہ کا ذکر ہے، اور محض اس ذکر سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غواصی وغیرہ انسانوں کی سی غواصی وغیرہ تھی، تاوقتیکہ یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ غواصی بغیر اس طریقے کے ممکن نہیں ہے جس طریقہ سے انسان غوطہ لگاتا ہے، اور ظروف سازی وغیرہ امور انہی طریقوں میں منحصر ہیں جنہیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ اگر محض یہ بات کہ جو فعل انسان کرتا ہے وہ کسی ہستی کی طرف منسوب کیا گیا ہے، یہ حکم لگانے کے لیے کافی ہو کہ وہ ہستی لامحالہ انسان ہی ہونی چاہیے، تو ایک شخص نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ کو انسان کہہ سکتا ہے کیوں کہ قرآن میں بعض وہ افعال جو انسان کرتے ہیں، خدا کی طرف منسوب کیے گئے ہیں۔ مثلاً بولنا۔

لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر اس پہلو سے قطع نظر کر کے یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ انسانوں کی طرح نظر آتے تھے، اور انسانوں ہی کی طرح وہ سب افعال کرتے تھے جن کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے، تب بھی جو آیت آپ پیش فرما رہے ہیں اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس گروہِ مخلوقات سے خارج تھے جو نظر نہیں آتا۔ اس لیے کہ کسی مخلوق کا ایسا ہونا کہ وہ انسان کو نظر نہ آئے اس بات کو مستلزم نہیں ہے کہ اس کا نظر آنا ممکن ہی نہ ہو، اور بطورِ خرقِ عادت بھی وہ نظر نہ آسکے۔ قرآن مجید میں شیاطین جن کے غیر مرئی ہونے کی صفت تو صرف ایک ہی جگہ بیان ہوئی ہے۔ مگر ملائکہ

کی اس صفت کا متعدد مقامات پر ذکر آیا ہے۔ مثلاً

اِنِّیٓ اَرٰی مَا لَا تَرَوْنَ (۸ : ۶) — یعنی شیطان نے اپنے اولیاء سے کہا کہ میں فرشتوں کی وہ فوجیں دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں۔

فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلَیْہِ وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا (۹ : ۶) — پھر اللہ نے اپنی سکینت اس پر اتاری اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید کی جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا (۹ : ۴) — اور وہ لشکر اتارے جن کو تم نہ دیکھتے تھے۔

اِذْ جَآءَتْکُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَیْھِمْ رِیْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْھَا (۳۳ : ۲) — جب تم پر فوجیں حملہ آور ہوئیں تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور وہ لشکر بھیجے جو تم کو نظر نہ آتے تھے

یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِکَۃَ لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ (۲۵ : ۳) — جس روز یہ لوگ ملائکہ کو دیکھیں گے اس روز مجرموں کی خیر نہ ہوگی۔

اس کے باوجود متعدد مواقع پر قرآن مجید ہی نے بیان کیا ہے کہ ملائکہ انسانی شکل میں آئے ہیں، نہ صرف انبیاء بلکہ عام انسانوں تک نے ان کو دیکھا ہے اور ان کی باتیں سنی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان بہت سی مستثنیٰ مثالوں کو دیکھ کر آپ نے ملائکہ کے متعلق بھی کیوں نہ کہہ دیا کہ ان سے مراد بھی انسانوں ہی کا ایک طبقہ ہے؟ غیر مرئی ہونے میں دونوں برابر۔ انسانی شکل میں ظاہر ہونے کے واقعات ملائکہ میں متعدد اور جنوں میں صرف ایک، باوجود اس کے تعجب ہے کہ آپ ملائکہ کے متعلق تو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے بطور معجزہ و خرق عادت بار بار وہ انسانی صورت اختیار کرتے رہے ہیں لیکن جنوں کے متعلق اس قسم کا ایک واقعہ سن کر آپ کا ذہن اس طرف نہیں جاتا کہ حضرت سلیمانؑ کی غیر معمولی دعا کو قبول کر کے جس طرح اللہ تعالیٰ نے

خرقِ عادت کے طور پر ہوا اور پرندوں کو اُن کے تابع کیا تھا اور اُن کو جانوروں کی بولیاں سکھائی تھیں اُسی طرح بطور خرقِ عادت اس نے جنوں کو بھی مرئی اور محسوس بنا دیا ہوگا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ قرآن کی تمام تصریحات اور لغت عرب کے خلاف یہ تاویل کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ صرف اس خاص موقع پر انسانوں کو "جن" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور مولانا اسلم جیراج پوری تو اس ایک مثال سے فائدہ اٹھا کر انسانوں کی ایک مستقل قسم کا نام ہی جن فرض کر لیتے ہیں درآں حالیکہ اس کے لیے کوئی قوی ثبوت اُن کو قرآن سے نہیں ملا اور اس کے خلاف قرآن مجید کی صریح آیات اور کلام عرب کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ اتنی بڑی ذمہ داری کا بار اٹھانے سے پہلے کیا اس بات پر غور کر لینا بہتر نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ایک غیر مرئی مخلوق کو مرئی بنا دینا کونسا ایسا مستبعد اور محال امر ہے کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی مشقت اور اتنے تکلف کی حاجت پیش آئے؟ جب آپ نے ملائکہ جیسی لطیف مخلوق کا مرئی ہو جانا مان لیا تو شیاطین جیسی کثیف مخلوق کے مرئی ہو جانے میں آپ کو اتنا استبعاد کیوں محسوس ہوتا ہے؟ قرآن مجید میں جنوں کی جو کچھ حقیقت بیان کی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ایک آتشیں مخلوق ہیں لیکن جبریل فرشتے کے متعلق تو یہ کہا ہے کہ وہ "روح" اور وہ بھی روح اللہ ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹ : ۲)۔	پھر ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے اچھے خاصے آدمی کی شکل میں نمودار ہوئی۔
وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (۲۶ : ۱۱)۔	یہ قرآن رب العالمین کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو لیکر روح الامین اترا ہے۔

جب "روح اللہ" جیسی مجرد از عوارض مادہ شئے کا باذن الٰہی مرئی ہو جانا ممکن ہے تو "نار السموم" جیسی چیز کا جو مادے اور مادی تکاثف سے قریب تر

ہے[1]، جسمیت اختیار کر لینا کیوں ناممکن یا بعید از عقل و قیاس ہے کہ اس سے بچنے کی خاطر قرآن میں تاویلات بعیدہ کا دروازہ کھولا جائے۔ قرآن کی رو سے تو صرف باری تعالیٰ ہی کی ذات ایسی ہے کہ انسان کی نگاہیں اس دنیا میں اس کو نہیں دیکھ سکتیں، لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ (۶: ۱۳) اور قَالَ رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ قَالَ لَنْ تَرَانِي (۷: ۱۷) یہ صفت بالذات صرف خدائے تعالیٰ کے لیے ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں ان میں سے کسی کے لئے بھی یہ صفت بالذات نہیں ہے۔ البتہ بعض کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ عادۃً وہ نظر نہیں آتیں لیکن اگر خدا چاہے تو وہ اس پر قادر ہے کہ خواہ اُن کو مرئی کر دے یا ہماری نظروں کو اتنا تیز کر دے کہ ان کی لطیف تر صورتوں کو دیکھ سکیں۔

تیسری دلیل آپ نے اور مولانا اسلم جیراج پوری نے اس بات سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس جو غوطہ خور اور معمار وغیرہ تھے ان کو "شیاطین" کہا گیا ہے۔

---

[1] جنوں کی تخلیق جس آگ سے ہوئی ہے وہ میرے نزدیک وہ آگ نہیں ہے جو کیمیاوی استحالات سے مادی اجسام میں پیدا ہوتی ہے، بلکہ وہ ایک خاص طور کی آگ ہے ہماری ان مادی آگوں سے مختلف۔ چونکہ انسانی زبان میں اس کو تعبیر کرنے کے لیے "نار" سے زیادہ اقرب کوئی لفظ نہ تھا، اس لئے حق تعالیٰ نے اس کو اس لفظ سے تعبیر فرمایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ سے مراد وہ شعاع نہیں ہے جو مادی نیرات سے نکلتی ہے، بلکہ ایک غایت درجہ مجرد اور منزہ حقیقت ہے جس کے تصور سے انسان کے ذہن کو روشن کرنے کے لیے لفظ "نور" سے زیادہ اقرب اور کوئی لفظ نہیں۔ تاہم اگر آپ کی یہ رائے مان لی جائے کہ "جن" اسی مادی آگ کے بنے ہوئے ہیں جو عناصر اربعہ میں سے ایک ہے، تو روحانی فرشتوں کے مقابلہ میں ان مادی جنوں کا مرئی محسوس بن جانا تو اور بھی زیادہ قریب از عقل و قیاس ہے۔

اور شیاطین کا اطلاق جنّوں کی طرح انسانوں پر بھی کیا گیا ہے، اس لئے آپ کہتے ہیں کہ ان معماروں اور غوطہ خوروں کو ان کے مرئی ہونے اور انسانوں کے سے کام کرنے کی بنا پر شیاطین الانس کیوں نہ سمجھا جائے؟

اس کو دلیل کے بجائے میں صرف غلط فہمی کہوں گا۔ اوّل تو قرآن مجید میں حضرت سلیمانؑ کے کاریگروں اور خادموں کے لیے صرف شیاطین ہی کا لفظ نہیں آیا ہے بلکہ "جن" کا لفظ بھی آیا ہے، مثلاً

وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ (۲۷:۲) -

اور سلیمان کے لئے اس کے لشکر از قسم جن وانس وپرند جمع کیے گئے۔

وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ...... يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِى الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ[1] (۳۴:۲) -

اور جنوں میں سے جو اس کے (یعنی حضرت سلیمانؑ) کے آگے اس کے رب کے اذن سے کام کرتے تھے ..... جو کچھ وہ چاہتا وہ اس کے لیے بناتے تھے، بڑی بڑی عمارتیں، اور مورتیں اور لگن کی طرح کے حوض اور ایک جگہ جمی رہنے والی بھاری دیگیں ..... جب ہم نے سلیمانؑ پر موت کا فیصلہ کر دیا تو ان کو اس کی موت کی خبر کسی چیز نے کی وہ کچھ اور نہ تھا محض زمین کا کیڑا تھا جو سلیمان کے عصا کو کھا رہا تھا جب سلیمان گر پڑے تب ان جنوں پر یہ راز کھلا کہ اگر وہ غیب جاننے ہوتے تو اتنی مدت تک اس ذلت غلامی کے عذاب میں نہ رہتے۔

ص ۵۶

[1] یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں "جن" کے ساتھ انس کا لفظ نہیں آیا ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ (بقیہ نوٹ صفحہ ملاحظہ ہو)

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ غوطہ خور اور معمار شیاطینِ جن کی قسم سے تھے، شیاطین الانس نہ تھے۔

دوسرے یہ بات آپ کی اور مولانا کی نظر سے پوشیدہ رہ گئی کہ قرآن مجید میں کہیں مطلقاً الشیطان اور الشیاطین بول کر انسان مراد نہیں لئے گئے ہیں، بلکہ ابلیس اور اس کی ذریت مراد لی گئی ہے۔ ہاں اگر کہیں انسانوں کے کسی گروہ کے لیے شیاطین کا لفظ بطور صفت استعمال کیا گیا ہے، تو ایسے ہر موقع پر صراحۃً یا کنایۃً یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاں شیاطین سے مراد انسان ہیں جیسے جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِينَ الْإِنسِ وَالْجِنِّ (۶: ۴) اور وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ (۲: ۲)۔

ایمان بالکتاب کا مقتضیٰ

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ کوئی ایسی قوی دلیل موجود نہیں ہے جس کی بنا پر سیدنا سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں، یا کسی دوسرے مقام پر لفظ "جن" کے معنی متعین کرنے میں اُس معنی سے انحراف کرنا جائز ہو جس کی تصریح خود قرآن مجید متعدد مواقع پر کر چکا ہے۔ اور جب ایسا نہیں ہے تو کسی شخص کے لیے جو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے پر ایمان رکھتا ہو، یہ جائز نہیں کہ جس کو خدا نے "جن" کہا ہے اور آدمی نہیں کہا اس کو وہ اپنے قیاس سے

یہ جن وہ جن تھے جن کو غیب دانی کا گھمنڈ تھا۔ انہی جنوں میں سے ایک گروہ بعد میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن سن کر اپنے دوسرے ہم قوموں سے کہتا ہے کہ اب ہمارے غیب دانی کے وسائل ہم سے چھن گئے ہیں اور اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا ۝ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا (۷۲: ۱)۔

اس آیت میں غیب کی خبریں حاصل کرنے کی جو صورت بیان کی گئی ہے وہ انسان کی سمجھ میں بھی نہیں آتی کجا کہ کوئی انسان اس پر قادر ہو۔

آدمی کہہ دے۔ ایسا قیاس کرنے کے لیے اگر کوئی سبب داعی ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ عادت جاریہ جس کا مشاہدہ اور ادراک کرنے کے ہم خوگر ہیں' اُن واقعات کے خلاف ہے جو بعض مواقع پر قرآن مجید میں جنوں کی طرف منسوب کیے گئے ہیں لیکن اسی طرح آگ کا ایک خاص شخص کے لیے سرد ہو جانا' لکڑی کا ایک خاص موقع پر اژدہا بن جانا' دریا کا ایک خاص وقت میں پھٹ کر راستہ دے دینا' ایک شخص کا مٹی کے پرند بنا کر اُن میں جان ڈال دینا اور مردوں کو زندہ کر دینا' چند آدمیوں کا ایک غار میں ۳۰۹ برس تک پڑے سوتے رہنا اور پھر بھی زندہ رہنا' ایک شخص کا مرنے کے سو برس بعد جی اٹھنا اور اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو جوں کا توں بالکل تازہ حالت میں پانا' ایک شخص کا ساڑھے نو سو برس تک زندہ رہنا اور وہ بھی یوگ کی مشقوں سے نہیں بلکہ ایک منکر قوم کے مقابلہ میں تبلیغ دین کی تھکا دینے والی مشقتوں کے ساتھ' یہ اور ایسے ہی متعدد واقعات ہیں جو قرآن مجید میں بیان کیے گئے ہیں اور سب اُس عادت جاریہ کے خلاف ہیں جس کو دیکھنے کے ہم خوگر رہے ہیں۔ اگر ہم قرآن کو خدائے علیم وخبیر اور قادر و توانا کا کلام نہ مانیں تو سرے سے ان واقعات کی تاویل ہی کرنے کی ضرورت نہیں محض اس بنیاد پر ہی ان سب کو جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ایسا ہوتے ہم نے کبھی نہیں سنا اور نہ دیکھا۔ اور اگر ہم یہ مان لیں کہ قرآن اُس خدا کا کلام ہے۔ جو ازل سے ابد تک عالم وجود کے ہر چھوٹے بڑے واقعہ کا حقیقی علم رکھتا ہے' اور خدا وہ خدا ہے جس کے معجزے ہم کو سورج اور سیاروں' اور زمین' اور خود اپنے وجود میں ہر آن نظر آ رہے ہیں' تو ہمیں کسی غیر معمولی اور خلاف عادت واقعہ کو بعینہٖ اُسی طرح تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا جس طرح وہ قرآن میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات تو کیا چیز ہیں' اگر قرآن میں کہا گیا ہوتا کہ ایک وقت میں چاند کو ماؤنٹ ایورسٹ پر لا کر رکھ دیا گیا تھا' اور کسی وقت خدا نے سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکالا تھا' تب بھی ایک مومن صادق کو اس بیان کی صداقت میں ایک لمحہ کے لیے شک نہ ہو سکتا تھا' اور نہ کسی طرح تاویل کر کے اس کو عادتِ جاریہ کے مطابق

ثابت کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔ اس لئے کہ یہ کائنات جس کی وسعت کا تصور کرنے سے ہمارا دماغ تھک جاتا ہے، اور اس کائنات کی ہر شئے حتیٰ کہ گھانس کا ایک تنکا اور کسی جانور کے جسم کا ایک بال بھی اپنی پیدائش میں درحقیقت اُتنا ہی حیرت انگیز اور اعجاز نما ہے جتنا چاند کا الٹ پھٹ پر آجانا اور سورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ ایک قسم کے واقعات کو دیکھنے کی ہمیں عادت ہوگئی ہے، اس لیے ہم کو اُن کے معجزہ ہونے کا شعور نہیں ہوتا، اور دوسری قسم کے واقعات شاذ ہیں اس لیے اُن کی خبر جب ہم کو دی جاتی ہے تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے اور ہماری عقل جو صرف مشاہدات و تجربات پر اعتماد کرنے کی خوگر ہوگئی ہے ان کو باور کرنے میں جھجکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے واقعات کے متعلق جب ہم کو کوئی خبر دی جائے تو ہمیں حق ہے کہ ان کے وقوع کے متعلق قابل وثوق شہادت طلب کریں لیکن ایک مومن کے لیے قرآن سے بڑھ کر قابل وثوق شہادت اور کوئی نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ یہ کتاب خدا کا کلام ہے، اور خدا کے فعل پر خود خدا ہی کی شہادت سب سے زیادہ معتبر ہے۔ البتہ جو شخص قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں شک رکھتا ہو اس کو حق ہے کہ قرآن کے ہر بیان میں شک کرے، خواہ وہ عادت جاریہ کے موافق ہو یا مخالف۔ (باقی)

تازہ ترین اور اہم خبر

الاعظم ہفتہ وار میں معنوی اور صوری انقلاب عظیم

الاعظم ہفتہ وار اپنے وسیع اور مکمل حالات ملک کی فراہمی میں جس قدر ہمہ گیر شہرت رکھتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں ملک میں یہی ایک اخبار ہے جو اہل ملک کو مملکت آصفیہ کے چپہ چپہ کے حالات سے واقف کراتا ہے۔

اس سال سے اس میں ایک زبردست معنوی اور صوری انقلاب پیدا کیا گیا ہے

(۱) ۲ ارامرداد سے اخبار ہر ہفتہ اپنے مقررہ بڑے سائز کے (۱۲) صفحات کے عوض بیس صفحات پر شائع ہوا کریگا۔ جس میں ملک کے حالات بالتفصیل ہونیکے علاوہ دلچسپ علمی ادبی مقالات منظومات ظریفانہ مضامین اور تمام ذہنی دلچسپیوں کا اجتماع ہوا کریگا۔

(۲) اس کے علاوہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں ایک دیدہ زیب دلچسپ اور (۶۸) صفحات کا ضخیم بلند پایہ ادبی نمبر (رسالہ) بھی ماہ دی ۱۳۴۲ف سے شائع ہو رہا ہے جو ہفتہ وار کے خریداروں کو بلا مزید قیمت کے دیا جاتا ہے

ایکہزار روپیہ کے ایک سو تین نقد انعامات

(۳) اسکے ساتھ ہی ۱۳ ارادی بہشت ۱۳۴۲ف تک ہونے والے تمام جدید خریداروں میں متذکرہ انعامات بذریعہ قرعہ اندازی تقسیم ہونگے۔ انعامات سو روپیہ سے لیکر پانچ روپیہ تک مقرر ہیں۔

باوجود ان تمام باتوں کے الاعظم کی سالانہ قیمت مع محصولڈاک صرف چھ روپیہ ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ اس قیمت میں ان خصوصیتوں کے ساتھ آپ کو کوئی ہفتہ وار اخبار نہیں مل سکتا۔

مینیجر الاعظم ثریا بلڈنگ پتھر گٹھی حیدرآباد دکن

آپ کا کتب خانہ

کون کون سی کتابوں سے خالی ہے

اس کا جواب ان الماریوں سے ملے گا جن میں آپ کی کتابیں چنی ہوئی ہیں۔ نئی دنیا پرانے نظریوں کے متعلق کیا رائے رکھتی ہے اس کے مصنفین ہمارے سامنے کیا نئی باتیں پیش کر رہے ہیں۔ شاہراہ ترقی پر کون کس سے آگے ہے اور پہلے کہاں تھا؟ ان تمام سوالات کے کے جواب آپ کو اپنے کتبخانہ سے ملنے چاہئیں۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ اپنے ذخیرہ پر پوری توجہ رکھیں۔ آج آپ اسی نظر سے اپنے کتب خانہ کو دیکھیے اور اس میں جو کمی ہو اس کو پورا کرنے کے لیے ہمارے کتب خانہ کو لکھیے جہاں عربی فارسی اور خصوصاً اردو زبان کی تمام علمی، ادبی، تاریخی وفنی جدید وقدیم تصنیفات نہایت تلاش اور جستجو سے مہیا کی جاتی ہیں اور اکثر کمیاب قدیم تصانیف نہایت اہتمام سے خود طبع کرا کر پیش کی جاتی ہیں علاوہ ازیں **درسی کتابیں** منظور شدہ سررشتہ تعلیمات سرکار عالی از انفنٹ تا بی اے کلاس زبان عربی، فارسی، اردو، انگریزی، مرہٹی، تلگو، کنڑی وغیرہ نیز کنڈر گارٹن، ماڈل کے منٹ و نقشہ جات دیواری نقشے ہر قسم کے چارٹس اسباق الاشیاء وغیرہ مدارس کے اور دیگر دفاتر کے فارمس اور ڈرائنگ کا سامان بالکل واجبی قیمتوں پر حاصل کیجیے۔

سید عبد القادر تاجر کتب

دا لک اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز چار مینار حیدرآباد دکن

مکتبہ علمیہ

قواعد

رسالہ ترجمان القرآن بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہوں گی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیے۔ ورنہ پرچہ نہ پہنچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر لازم نہیں کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن بدر الدین بلڈنگ نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

(طابع و ناشر سید ابوالاعلیٰ مودودی)

(مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چارمینار حیدرآباد دکن)